داستانِ کربلا

حادثہ کربلا پر مشاہیر علما اور
ممتاز اہلِ قلم کے بصیرت افروز
مقالات کا مجموعہ!

مرتبہ

محمد عبد الرحمٰن سعید صدّیقی

نفیس اکیڈیمی
بلاسس اسٹریٹ۔ کراچی (پاکستان)

قیمت:۔ تین روپے

طبع اول ———— مارچ ۹۴۵

طبع دوم ———— ستمبر ۱۹۴۶ء

طبع سوم ———— اکتوبر ۱۹۵۱ء

کتابت: محمد وسیم خوشنویس

مطبوعہ
ادبی پریس کراچی

فہرست

ذکرِ حسینؑ	ڈاکٹر ذاکر حسین خاں
شہادتِ حسنیٰ	مولانا سید مناظر احسن گیلانی
شہادتِ کبریٰ	قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم
یادِ حسین علیہ السلام	مولانا ابوالکلام آزاد

اے کربلا کی خاک اس احسان کو نہ بھول
تڑپی ہے تجھ پہ لاش جگر گوشۂ رسول

اسلام کے لہو سے تری پیاس بجھ گئی
سیراب کر گیا تجھے خونِ رگِ رسول!

کرتی رہے گی پیش شہادت رسول کی
آزادئ حیات کا یہ سرمدی اصول

(مولانا ظفر علی خان)

کون وفساد کے اس قدیم عالم میں مظلومیِ حق کی مثالیں
نہیں ہیں۔ خاکدانِ ارضی کے آثار اقوام وملل کی حیات کے
و روز اور تاریخ کے اوراق ان شواہد سے بھرے پڑے ہیں
خلیلؑ کی بت شکنی کا جواب آتشِ نمرود، حضرت یوسفؑ کی
منی کا صلہ زندانِ مصر، حضرت زکریاؑ کے اعلانِ حق کا نتیجہ آپ
ہ کشی، حضرت عیسیٰؑ کے وعظ کی تلقین کا بدلہ رومی صلیب اور
سولؐ کی دعوت الی اللہ کے مقابلہ میں ترہیب وترغیب اور
و آلام کی بے پناہ آزمائشیں!

ایثار وفدویت کے ان ہی واقعات میں کربلا کے حادثہ عظیم کو بھی
مقام حاصل ہے۔ یہ مظلومیِ حق کی ایسی دردانگیز مثال ہے
مظلوم گذشتہ تیرہ صدیوں سے آنسوؤں کے کتنے سیلاب
دلوں سے رواں ہو چکے ہیں۔

ت شبیر علیہ السلام کے مضمرات پر عزاداری اور راہِ حق

میں مجاہدانہ جاں نثاری کے نقاط نظر سے بہت کچھ لکھا اور کہا جاچکا ہے۔ آپ کی مظلومی اور بےبسی کا بلا امتیاز فرقہ و ملت ہر دوست و دشمن کو اعتراف ہے۔ لیکن اسرار شہادت سے متعلق جہاں اہل نظر کی بصیرت افروز موشگافیاں ہیں۔ وہیں "عقلیت" در لشنلزم کے پرستاروں نے کربلا کی معرکہ آرائی پر منطقیانہ رد و قدح بھی کی ہے چونکہ شبیرؑ و یزید کے مسئلہ پر ٹھیٹھ تاریخی نقطۂ نظر سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ اگر محسوس کی بھی گئی تو بعض محتاط بزرگوں نے اس قیل و قال سے عمداً اجتناب کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اس گروہ نے واقعہ شہادت کے اسرار و غوامض کو محبانہ اہل بیعت کے ساتھ محض عقیدتمندی پر محمول کیا۔ انکار بیعت کو جماعت بندی سے تعبیر کیا گیا۔ کوفہ کی روانگی کو حصول خلافت کی آرزو۔ اور کربلا کی معرکہ آرائی کو خاکم بدہن، دو حریفوں کے اغراض و مفاد ذاتی کا تصادم خیال کیا گیا۔ غرض ان معترضین نے اپنے نکتہ نگاہ میں غلو کے باعث منطقی استدلال کے میدان میں وہ قلابازیاں کھائی ہیں کہ ان کے ہاتھ سے حق شناسی کا دامن چھوٹ گیا۔ اور اندیشہ ہے کہ غیر معتدل تصورات کی یہ رو نئی پود کے اذہان کو مسموم کردے۔ وقت کا اقتضا ہے کہ تاریخ کی روشنی میں اس مسئلہ پر تمام اعتراضات کی تنقیح کی جائے۔ تاکہ یہ ثابت ہوجائے فرزند رسول علیہ السلام ہی کا اسوہ مسلمانوں کیلئے سرمایہ اتباع و تقلید ہے۔ واقعہ شہادت کے سلسلہ میں عموماً حسب ذیل اعتراضات

لئے جاتے ہیں۔

(۱) حضرت امام حسینؑ نے یزید کی بیعت سے کیوں انکار کیا؟ کیا انکار اپنے دعویٰ خلافت کو منوانے کا اقدام نہ تھا؟

(۲) اگر انکار بیعت توریث کے خلاف احتجاج تھا۔ تو حضرت علیؑ یا حضرت امام حسین علیہ السلام کے بعد حضرت امام کا اپنے آپ کو حقدار خلافت تصور کرنا کیا بجائے خود توریث کی ترویج کے مترادف نہ تھا؟

(۳) حضرت امام کو اگر قرآن اور سنت کی روشنی میں ملک و ملت کی فلاح منظور تھی۔ تو کیا انکار بیعت سے تفریق ملت کے بغیر خلیفۂ وقت کو راہ راست پر لانے کی کوشش نہیں کی جا سکتی تھی؟ انکار بیعت نے حضرت امام اور یزید میں عناد کی آہنی دیوار کھڑی کر دی جو بالآخر کربلا کے خونین معرکہ پر منتج ہوئی۔

(۴) یزید کے مقابلہ میں معرکہ آرائی حضرت امام کے نقطۂ نظر سے فی الحقیقت جہاد فی سبیل اللہ تھا۔ تو وہ وقوع جنگ سے قبل حضرت نے یہ تین شرطیں کیوں پیش کیں؟

(الف) جہاں سے آیا ہوں مجھے وہیں لوٹ جانے دو

(ب) مجھے خود یزید سے اپنا معاملہ طے کر لینے دو

(ج) مجھے مسلمانوں کی کسی سرحد پر بھیج دو وہاں کے لوگوں پر جو گذرتی ہے۔ وہ مجھ پر بھی گزرے گی

(۷) اس عہد میں عربی معاشرہ کا رنگ عجمی ہو چکا تھا۔ قبائل کی باہمی رقابتیں انتہا کو پہونچ چکی تھیں۔ اگر بنی امیہ کا فرد نہ ہوتا۔ تو کیا قومی عصبیت کا انتشار، باہمی افتراق و نزاع کا سیلاب اسلامی حکومت کے لئے خطرہ ثابت نہ ہوتا۔

چونکہ ان سارے مسائل کا بنیادی تعلق خلافت سے ہے۔ اس لئے سب سے پہلے تصور خلافت کی توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلامی نظریہ سیاسی کا مرکز و محور اس کی روح اور اس کا جوہر یہ عقیدہ ہے کہ حکم دینے اور قانون بنانے کا اختیار خدا کے سوا کسی فرد بشر کو حاصل نہیں۔ کسی شخص کا یہ حق تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کہ وہ حکم دے اور دوسرے اس کی اطاعت کریں۔ وہ قانون بنائے اور دوسرے اس کی پابندی کریں۔ یہ اختیار صرف اللہ ہی کو حاصل ہے

ان الحکم الا للہ امر الا تعبدوا الا ایاہ ذالک الدین القیم

حکم سوائے اللہ کے کسی اور کا نہیں اس کا فرمان ہے کہ اسکے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے۔

اس سے منطقی طور پر یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ جب حاکمیت صرف خدائے واحد کے لئے مخصوص ہے۔ اور قانون ساز بھی صرف اسی کی ذات ہے۔ تو کوئی انسان خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو۔ بہ ذات خود حکم دینے یا منع کرنے کا مجاز نہیں۔ البتہ اللہ کی زمین پر جو کوئی حکمراں ہو اسلامی دستور کے مطابق لامحالہ وہ حاکم اعلیٰ کا خلیفہ تصور کیا جائیگا

و صرف مفوضہ اختیارات استعمال کر سکتا ہے۔

اس پاک اور بے لوث عقیدہ کو لے کر اسلام دنیا میں آیا۔ تو وہ
پنے وقت کی سب سے بڑی انقلابی قوت تھا۔ اس وقت کی بدولت
سالح عناصر کی ترکیب و امتزاج سے ایک زبردست امّت کو قوامِ حیات
تیار ہوا۔ پھر اسوۂ نبوت کے اثر سے غیر متزلزل تقوی و کردار کے
سروسامان نے اسلامی تحریک میں دفاعِ حق اور انجذابِ حق کی قوتیں
جمع کر دی تھیں۔ اور ان ہی کی دو قوتوں کے باہمی اتحاد کا نام دراصل
خلافت ہے۔ اللہ نے خلافت کا وعدہ چونکہ تمام مومنوں سے کیا ہے
اس لئے ہر مومن خلافت کا حامل ہے۔ اسلامی معاشرہ میں طبقات
کی تقسیم اور معاشی یا معاشرتی امتیازات کو دخل نہیں ہے۔ اس میں افراد مساوی
الحیثیت اور مساوی المرتبہ ہوتے ہیں۔ البتہ فضلیات کا مدار علم صحیح اور
عمل صالح۔ شخصی قابلیت اور اعلی سیرت پر ہوا کرتا ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقکم
خلافت کے معنے جانشینی یا قائمقامی کے ہیں۔ لیکن مسندِ خلافت پر صرف
متمکن ہو جانے سے جانشینی کے مقصد کی تکمیل نہیں ہو جاتی۔ بلکہ جانشینی باعتبار
عہدہ۔ باعتبار منصب، باعتبار فرائض۔ باعتبار اخلاق و اعمال اور باعتبار
مراتب و کمال ہوا کرتی ہے۔ خلیفہ حقیقتاً وہی ہے۔ جو اپنے پیش رو کے
کمالات و خصوصیات کا زیادہ سے زیادہ حامل ہو۔

حضور اکرم صلعم کو دنیوی نقطہ نظر سے سلطنت کی داغ بیل ڈالنی
مقصود نہ تھی۔ آپ ایسی نوعیت کی تعمیر فرمانے تھے جو انسانیت اور

اخلاق کے جوہر سے آراستہ ہو اور تیغ و خنجر کے بجائے شرافت نفس کی مدد سے دنیا میں حکومت الٰہیہ قائم کرے۔ ان تنقیحات کی روشنی میں ظاہر ہے کہ منصب خلافت کا اہل وہی ہو سکتا ہے۔ جو ایک طرف سیرت و کردار کے لحاظ سے مکمل ترین انسان ہو۔ اور دوسری طرف سیاسی حل و عقد کے اعتبار سے بنی آدم کی امامت کا حق ادا کرے۔

آئیے حالات کا جائزہ لیں کہ حضرت امیر معاویہؓ کے انتقال کے بعد منصب خلافت کے لئے کیا یزید کی شخصیت موزوں تھی؟ سب سے پہلے اس کے شخصی کردار کا محاسبہ ضروری ہے۔ جس کے لئے کسی خاص تلاش و تفحص کی حاجت نہیں ہے۔ خود امیر معاویہ کے حاریوں نے اس باب میں جو شہادت پیش کی ہے۔ اس سے حقیقت بالکل بے نقاب ہوتی ہے

۱۔ یزید کی جانشینی کا مسئلہ طے کرنے کے لئے بصرہ کے مسلمانوں کو ہموار کرنے کا کام زیاد کے تفویض ہوا تو اس نے فوراً اپنی ذمہ داری محسوس کی اور اپنے معتمد علیہ عبید بن کوکب کو بلا کر کہا۔

"یہ اسلام کا معاملہ ہے۔ بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ یزید جیسا کچھ لا ابالی ظاہر ہے۔ اس لئے تم جا کر امیر المومنین کو یزید کے مشاغل سے آگاہ کر دو۔ اور انھیں سمجھا دو کہ اسمیں وہ جلد بازی سے کام نہ لیں۔ عبید نے کہا کہ امیر المومنین کو یزید کی جانب سے بددل کرنا مناسب نہیں ہے۔ میں خود یزید کو سمجھاتا ہوں کہ وہ اپنے مشاغل کو چھوڑ دے تاکہ لوگوں کو گرفت اور مخالفت کا موقعہ نہ ملے"

تاریخ اسلام حصہ دوم مطبوعہ دارالمصنفین صفحہ ۲۴ و صفحہ ۲۵

۲- ابتدا سے ہی یزید کی طبیعت استبداد کی جانب مائل تھی۔ حضرت علیؓ کی خلافت کے بعد حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں عجمی ملوکیت کے جو آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ انھوں نے یزید کی فطری افتاد کو اور زیادہ زنگ آلود کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے مفاد کے تحفظ میں حق و ناحق جائز و ناجائز وسائل اختیار کرنے میں اسے کوئی دریغ نہ تھا۔

۳- کربلا کے حزنیہ کے معاً بعد حادثہ حرہ وقوع میں آیا جس میں ہزارہا صحابہ کرام شہید ہوئے اور مدینہ لوٹا گیا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے مقابلہ کے لئے ایک لشکر جرار مکہ معظمہ کو روانہ کیا۔ جہاں لشکر جرار نے اتنی آگ اور پتھر برسائے کہ حرم کعبہ کا غلاف تک جل گیا۔ ان واقعات سے یزید کے متشددانہ اور جابرانہ میلانات اور طرز عمل کی تصدیق ہوتی ہے

۴- یزید کے شخصی خصائل کا دامن بھی بے داغ نہیں ہے۔ اس کے حرم میں کئی بیویاں موجود تھیں۔ (تاریخ اسلام حصہ دوم صفحہ ۱۷)

ان امور سے قطع نظر اگر جمہور مسلمین نے یزید کو بہ طیب خاطر خلیفہ منتخب کر لیا ہوتا۔ تو اس کی ذمہ داری بہت کچھ گھٹ جاتی۔ لیکن افسوس ہے کہ امیر معاویہ نے اپنی زندگی ہی میں اس اثر و نفوذ کو استعمال کر کے جو بحیثیت امیر انھیں حاصل تھا۔ یزید کو اپنا جانشین بنایا تھا۔ یہ وہ پہلی بدعت تھی جس سے اسلامی نظام حکومت اور حریت کی روح مجروح ہو گئی اور اسلام کے

سیاسی لقب العین کو یہ ایسا کاری زخم پہنچا جو آج تک مندمل نہ ہو سکا۔

کہا جاتا ہے کہ یزید کی جانشینی کے مسئلہ پر حضرت امیر معاویہؓ نے ہمعصر صحابہ سے مشورے کر کے رائیں حاصل کر لیں تھیں۔ لیکن تاریخی شواہد سے اس دعوے کی تردید ہوتی ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ کوفہ کے حاکم مُغیرہ بن شعبہ نے امیر معاویہؓ کی خیر خواہی میں خلافت کا سلسلہ بنی امیہ کی نسل میں مستقل کر دینا چاہا۔ چنانچہ یزید کو ادہر توجہ دلائی یزید نے امیر معاویہؓ سے اس کا تذکرہ کیا۔ امیر نے مغیرہ سے مشورہ کیا انھوں نے کہا۔ "عثمان کی شہادت کے بعد سے مسلمانوں میں جو اختلاف اور خونریزی قائم ہے۔ آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ اسلئے میری رائے میں یزید کی ولیعہدی کی بیعت لے کر اسے جانشین بنا دینا چاہیئے۔ تاکہ جب آپ کا وقت آ ئے تو مسلمانوں کے لئے ایک سہارا اور جانشین موجود رہے۔ اور ان میں خونریزی اور فساد برپا نہ ہو۔" (تاریخ اسلام حصہ دوم ص۲۴ بحوالہ تاریخ طبری)

امیر معاویہ نے دریافت کیا کہ اس مہم کو انجام کون دے گا؟ اس وقت سیاسی حیثیت سے کوفہ و بصرہ اور مذہبی حیثیت سے حجاز مسلمانوں کے مرکز تھے۔ ان ہی پر اس قسم کے مہمات کا دارومدار تھا۔ مغیرہ نے کہا کہ کوفہ کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔ بصرہ کو زیادہ ہموار کرے گا۔ اور حجاز کی ذمہ داری مروان بن حکم سے متعلق کی جائے۔

کوفہ میں مغیرہ بن شعبہ کا بڑا اثر تھا۔ اور یہاں بنی امیہ کے حامیوں کی

بھی ایک جماعت موجود تھی۔ اس لئے مغیرہ نے کوفہ جاکر یہاں کے چند معززین کا ایک وفد شام بھجوایا۔ انھوں نے امیر معاویہ کی خدمت میں حاضر ہوکر خود یزید کی ولیعہدی کی تجویز پیش کی۔

زیاد گو امیر معاویہ کا قوت بازو تھا۔ اور اس کی سخت گیری کے سامنے یہ کوئی بڑا مشکل مسئلہ نہ تھا۔ لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے۔ اس معاملہ میں اسے بھی اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا۔ کوفہ اور بصرہ سے زیادہ اہم معاملہ حجاز کا تھا۔ یہیں وہ بزرگ تھے۔ جو خود خلافت کے مدعی ہو سکتے تھے۔ اور جس کی جانب سے اس تجویز کی مخالفت کا خطرہ تھا۔ اسکی ذمہ داری امیر نے مروان بن حکم کے سپرد کی اور اس کو لکھا

"اب میں ضعیف ہو گیا ہوں۔ میرے قوٰی کمزور ہو گئے ہیں معلوم نہیں کب وقت آجائے۔ مجھے خوف ہے کہ میرے بعد پھر امت میں اختلاف نہ پیدا ہو جائے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی بھلائی کے لئے اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین بنا جاؤں۔ اس معاملہ میں تمہارا مشورہ ضروری ہے۔ اس کو اہل مدینہ کے سامنے پیش کرو۔ اور جو جواب ملے۔ اس سے مجھے مطلع کرو۔"

(تاریخ اسلام حصہ دوم صفحہ ۲۵)

مروان نے اس مسئلہ کو اہل مدینہ کے سامنے پیش کیا۔ امیر معاویہ رضی نے خط میں کسی جانشین کا نام درج نہیں کیا تھا۔ بلکہ محض جانشینی کی تجویز تھی چونکہ اس حد تک یہ تجویز مفید و مناسب تھی۔ سب نے اس سے

اتفاق کیا۔ مروان نے امیر معاویہؓ کو اس کی اطلاع دی تو انھو
نے جانشین کے اعلان کا حکم بھیجا۔ مروان نے یزید کے نام کا اعلان
اس کا نام سنتے ہی لوگوں نے اختلاف کیا۔ عبدالرحمان بن ابی بکرؓ نے
کرکہا تم اور معاویہ دونوں غلط کہتے ہو۔ اس سے امت کی بھلائی م
نہیں ہے۔ بلکہ خلافت کو ہرقل کی شہنشاہی بنانا چاہتے ہو۔ مروان نے
کہا کہ امیر المومنین چاہتے ہیں کہ ابوبکرؓ وعمرؓ کی طرح یزید کو نامزد کر جائیں
عبدالرحمٰن نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ ابی بکرؓ وعمرؓ کی سنت نہیں
قیصر وکسریٰ کا طریقہ ہے۔ ان دونوں نے اپنے لڑکوں کو ولیعہد
نہیں بنایا۔ بلکہ اپنے خاندان والوں تک کو اس سے دور رکھا۔ یہ
تفصیل مروان نے امیر معاویہؓ کو لکھ بھیجی۔

اس اثناء میں مدینہ بصرہ اور مختلف مقامات کے وفود شا
پہونچ چکے تھے۔ امیر معاویہؓ نے پہلے مدینہ کے ایک بزرگ محمد بن ع
بن حزمؓ سے گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ "ہر راعی اپنی رعیت کا ذمہ د
ہے اس لئے جسے آپ اُمّت کا راعی بناتے ہیں اس پر غور کر لیجیے"۔!
مدینہ کے وفد کے بعد بصرہ کے رئیس الوفد احنف بن قیس۔
جو بڑے مدبر اور با اثر رئیس تھے رائے طلب کی۔ انھوں نے جوا
دیا "اگر ہم سچ کہتے ہیں تو آپ کا ڈر ہے اور اگر جھوٹ بولتے ہیں

تاریخ اسلام حصہ دوئم بحوالہ تاریخ طبری

ز خدا کا خوف ہے۔ آپ یزید کے شب و روز کے مشاغل۔ اس
کے ظاہری اور پوشیدہ حالات سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔ اگر اس
کے بعد بھی اس کو امت محمدی کے لئے آپ بہتر سمجھتے ہیں۔ تو پھر اس
ں صلاح و مشورے کی کیا ضرورت ہے۔ اور اگر ایسا نہیں سمجھتے
ز خود دوسرے عالم کو جاتے ہوئے اس کو دنیا کا توشہ نہ دیجئے۔ ورنہ
ں تو آپ کا جو حکم ہو اس کا سننا اور بجا لانا ہمارا کام ہے"
لیکن امیر معاویہؓ یزید کی ولیعہدی طے کر چکے تھے۔ یہ محض رسمی
کارروائی تھی۔ اس لئے اخیر میں کچھ لوگوں کو ڈرا دھمکا کر اور اکثر کو
لطف و کرم سے ہموار کر لیا۔ اس طرح عراق و شام کے باشندوں
نے یزید کی بیعت کر لی[1]
لیکن اصل معاملہ حجاز کا تھا۔ کیونکہ مہاجرین و انصار کے باقیات
صحابہؓ اور صحابہ زادے یہیں تھے۔ اس لئے امیر معاویہ نے خود
مدینہ کا سفر کیا۔ اس وقت یہاں پانچ بزرگ حضرت عبداللہ بن
عبداللہ بن عباسؓ۔ عبداللہ ابن زبیرؓ۔ امام حسینؑ اور عبداللہ بن
ایسے تھے۔ جن کی جانب سے امیر معاویہ کو مخالفت کا خطرہ تھا۔
امیر معاویہ نے ان سب سے الگ الگ مل کر
تم پانچوں آدمیوں کے علاوہ سب نے یزید کی ولیعہدی

---

[1] تاریخ اسلام حصہ دوم بحوالہ تاریخ طبری

کرلی ہے اور تم ان پانچوں کی رہبری کر رہے ہو۔ ان میں سے عبدالرحمن بن ابی کے علاوہ ہر ایک نے جواب دیا کہ میں کسی کی رہبری نہیں کر رہا ہوں۔ آپ چاروں آدمیوں سے کہیئے۔ اگر وہ لوگ بیعت کر لیں تو مجھے بھی کوئی عذر نہ ہو گا۔ اس طرح گویا چاروں آدمیوں سے الگ الگ بیعت کا وعدہ لے لیا۔ عبدالرحمن بن ابی بکرؓ سے البتہ تلخ گفتگو ہوئی

ایک اور روایتؔ میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ امیر معاویہ کی آمد کی خبر سن کر یہ پانچوں بزرگ مدینہ سے مکہ چلے گئے امیر معاویہ بھی وہاں پہنچے اور ان سب کو لطف و مدارات اور حسن خلق سے مائل کرنے کی کوشش کی ان لوگوں نے فرداً فرداً گفتگو کرنے کی بجائے حضرت عبداللہ بن زبیر کو جو سب میں زیادہ تجربہ کار اور گویا تھے۔ اپنا نمائندہ بنایا۔ امیر نے ان سے کہا کہ تم لوگوں کے ساتھ میرا جو طرز عمل تھے۔ اور جتنی صلہ رحمی کرتا ہوں اور تمہاری جس قدر باتیں انگیز کرتا ہوں۔ وہ سب تم کو معلوم ہے۔ یزید تمہارا بھائی اور ابن عم ہے میں چاہتا ہوں کہ تم اسے خلیفہ کا لقب دیدو۔ باقی حکومت کا سارا انتظام۔ عمال کا عزل و نصب۔ خراج کی تحصیل وحصول اور اس کا صرف تمہارے ہاتھوں میں رہے گا۔

عبداللہ بن زبیرؓ نے اس کے جواب میں کہا کہ انتخاب خلیفہ کی

لہ تاریخ اسلام حصہ دوم بحوالہ ابن اثیر

تین نظیریں ہیں۔ یا تو رسول اللہ کی طرح کسی کو نامزد نہ کیجیے۔ مسلمان جسے پسند کریں گے۔ منتخب کر لیں گے۔ یا ابوبکرؓ کی طرح ایسے شخص کو نامزد کیجیے۔ جس سے آپ کا کوئی تعلق نہ ہو۔ یا عمرؓ کی طرح چند آدمیوں میں سے ایک کا انتخاب شوریٰ پر چھوڑ دیجیے۔ اس کے علاوہ کوئی چوتھا طریقہ ہم قبول نہیں کر سکتے۔[1]

امیر معاویہ نے جب دیکھا کہ یہ لوگ آسانی کے ساتھ بیعت کرنے والے نہیں۔ تو انھیں دھمکی دے کر چھوڑ دیا۔ کہ اگر تم لوگوں نے کوئی مخالفت کی۔ تو تلوار سے کام لیا جائے گا۔ اور باہر نکل کر مسلمانوں میں اعلان کر دیا۔ کہ یہ لوگ مسلمانوں کے سربرآوردہ اور ان کے بہترین لوگ ہیں۔ جن کے مشورے کے بغیر کوئی کام انجام نہیں دیا جائیگا۔ انھوں نے یزید کی بیعت کر لی ہے۔ اس لئے آپ لوگ بھی بیعت کر لیجیے۔ اہل مدینہ ان ہی بزرگوں کے فیصلے کے منتظر تھے اس لئے اس اعلان پر سب نے بیعت کر لی۔ امیر معاویہؓ کی واپسی کے بعد لوگوں کو اصل واقعہ کا علم ہوا لیکن پھر کسی نے مخالفت نہیں کی۔

امیر معاویہؓ نے مرض الموت کے دنوں میں جبکہ یزید دمشق میں موجود نہ تھا۔ اس کے لئے حسب ذیل وصیت ہدایات کے طور پر مرتب کرائی۔ تاکہ وہ متوقع خطرات سے آگاہ ہو جائے۔ اور نظام حکومت

---

[1] تاریخ اسلام حصہ دوم

کو اطمینان بخش طریقے پر چلا سکے۔

جان پدر! میں نے تمہاری راہ کے کانٹے ہٹا کر تمہارے لیے راستہ صاف کر دیا ہے۔ دشمنوں کو زیر کر کے سارے عرب کی گردنیں تمہارے آگے جھکا دی ہیں۔ اور تمہارے لیے ایک بڑا خزانہ جمع کر دیا ہے۔

سب سے اہم معاملہ خلافت کا ہے۔ اس میں حسین بن علیؓ عبداللہ بن عمرؓ۔ عبدالرحمان بن ابی بکرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ کے علاوہ کوئی حریف نہیں ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ سے کوئی خطرہ نہیں۔ انہیں زہد و عبادت کے علاوہ کسی چیز سے واسطہ نہیں۔ عام مسلمانوں کی بیعت کے بعد بھی کوئی عذر نہ ہوگا۔ عبدالرحمن ابی بکرؓ میں کوئی ذاتی حوصلہ یا ہمت نہیں ہے۔ جان کے ساتھی کریں گے وہ اس کے پیرو ہو جائیں گے۔ البتہ حسین بن علی کی جانب سے خطرہ ہے۔ اہل عراق انہیں تمہارے مقابلہ میں لا کر چھوڑیں گے جب وہ تمہارے مقابلہ پر آئیں۔ اور تم کو ان پر قابو حاصل ہو جائے تو درگذر سے کام لینا کہ وہ قرابت دار۔ بڑے حقدار اور رسول اللہ صلعم کے عزیز ہیں! البتہ جو شخص لومڑی کی طرح کاوے دے کر شیر کی طرح حملہ کریگا۔ وہ عبداللہ بن زبیرؓ ہے۔ اگر وہ صلح کر لیں تو نہیا ورنہ قابو پانے کے بعد ان کو ہرگز نہ چھوڑنا اور ان کے ٹکڑے اڑا دینا!

(تاریخ اسلام حصہ دوم مطبوعہ دار المصنفین صفحہ ۲۹)

یہ اس رسمی کارروائی کی داستان ہے۔ جو یزید کو خلیفہ بنانے کے لئے اختیار کی گئی تھی۔ اب انکار بیعت کے بارے میں امام کے منشاء پر بھی غور کیجئے!

امیر معاویہؓ کے انتقال کے بعد یزید کے حکم سے جب ولید حاکم مدینہ نے حضرت امام حسینؑ سے بیعت طلب کی تو آپ نے ارشاد فرمایا "مجھ جیسا آدمی چھپ کر بیعت نہیں کر سکتا۔ اور نہ میرے لئے یہ زیبا ہے۔ جب عام لوگوں کو بیعت کے لئے بلاؤ گے۔ تو اس وقت میں بھی آجاؤں گا۔[1] اس جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیعت میں آپ کا تامل اصولی اختلاف پر مبنی تھا۔ گو یزید کے مقابلہ میں خلافت کے لئے آپ کے حق کو خود امیر معاویہ نے تسلیم کیا ہے۔ تاہم اگر یزید بہ لحاظ اہلیت شرائط خلافت کی تکمیل کر سکتا۔ اور صحیح اصول پر اس کا انتخاب عمل میں آتا۔ تو حضرت امام کو بیعت کرنے میں کوئی عذر نہ ہوتا۔

۲۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کے بعض خطبوں سے جو آپ نے سفر کے دوران میں ارشاد فرمائے ہیں۔ مترشح ہوتا ہے کہ آپ خلافت کے دعویدار ضرور تھے۔ لیکن اس دعویداری کا ہرگز یہ منشاء نہ تھا کہ جمہور مسلمین کی رائے کے علی الرغم آپ مسند خلافت پر قابض ہونا چاہتے تھے کہ کوفہ کے راستہ میں اپنے ایک خطبہ میں آپ نے ارشاد فرمایا

---

[1] تاریخ اسلام حصہ دوم

"اے لوگو! اگر تم تقوے پر رہو اور حقدار کا حق پہچانو۔ تو یہ خدا کی خوشنودی کا موجب ہوگا۔ ہم اہل بیت ان مدعیوں سے زیادہ حکومت کے حقدار ہیں۔ ان لوگوں کو کوئی حق نہیں پہونچتا۔ یہ تم پر ظلم و جور سے حکومت کرتے ہیں۔ لیکن اگر تم ہمیں ناپسند کرو۔ ہمارا حق نہ پہچانو۔ اور تمہاری رائے اب اس کے خلاف ہو گئی ہو۔ جو تم نے مجھے اپنے خطوں میں لکھی اور قاصد کی زبانی پہونچائی تھی۔ تو میں واپس جانے کے لئے بخوشی تیار ہوں۔"

(تاریخ ابن جریر و کامل)

یزید کو حکومت دلانے میں اگر ملوکیت کا زور و استبداد استعمال نہ کیا جاتا۔ اور شوریٰ کے ذریعہ خلیفہ کا انتخاب ہوتا۔ تو ظاہر ہے کہ حضرت امام حسینؑ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی موجودگی میں یزید کسی طرح خلیفہ منتخب نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر حضرت علی کے بعد حضرت امام حسنؑ اور ان کے بعد حضرت امام حسینؑ رائے عامہ کی بناء پر خلیفہ منتخب ہوتے۔ تو یہ صورت ہرگز توریث نہیں کہی جا سکتی۔ توریث تو یہ ہے کہ باپ اپنی زندگی میں جمہوریت کے اقتضاء کے خلاف اپنے بیٹے کو جانشین نامزد کرے اور اس نامزدگی سے اختلاف کی ہر آواز کو ملوکیت اور استبداد کے زور سے بے اثر کر دیا جائے۔

۳۔ توریث کے خلاف احتجاج و ناراضی کے علاوہ حضرت امامؑ کی نظر میں یزید کی حکومت غیر شرعی حکومت تھی۔ اس لئے ایسے نظام

حکومت سے اشتراک عمل کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اثناء سفر کوفہ میں مقام بیضہ پر دوستوں اور دشمنوں کو مخاطب کر کے آپ نے ارشاد فرمایا۔

لے لوگو! رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ جو کوئی ایسے حاکم کو دیکھے جو ظلم کرتا ہے۔ خدا کی قائم کی ہوئی حدیں توڑتا ہے عہد الٰہی شکست کرتا ہے۔ سنت نبوی کی مخالفت کرتا ہے خدا کے بندوں پر گناہ اور سرکشی سے حکومت کرتا ہے اور دیکھنے پر بھی نہ تو اپنے فعل سے اس کی مخالفت کرتا ہے اور نہ اپنے قول سے۔ تو خدا ایسے آدمیوں کو اچھا ٹھکانہ نہیں بخشے گا۔ دیکھو یہ لوگ شیطان کے پیرو بن گئے ہیں رحمان سے سرکش ہو گئے ہیں۔ فساد ظاہر ہے۔ حدود الٰہی معطل ہے مال غنیمت پر ناجائز قبضہ ہے۔ انکی سرکشی کو حق و عدل سے بدل دینے کا میں سب سے زیادہ حقدار ہوں!"

(تاریخ ابن اثیر جلد چہارم صفحہ ۱۰۱)

ایک اور خطبہ میں ارشاد فرمایا۔

افسوس دیکھتے نہیں کہ حق پس پشت ڈال دیا گیا ہے باطل پر علانیہ عمل کیا جارہا ہے۔ کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ پکڑے۔ وقت آگیا ہے کہ مومن حق کی راہ میں لقاء الٰہی کی خواہش کرے لیکن میں شہادت کی موت چاہتا ہوں۔ ظالموں کے ساتھ

زندہ رہنا بجائے خود جرم ہے (تاریخ ابن جریر دکامل)

ایک طرف صدق وصفا۔ ایمان وعمل، صداقت وحق پرستی کا غیر متزلزل جذبہ کار فرما تھا۔ اور دوسری طرف حکومت واستیلا جبر و استبداد آمریت وقاہریت اپنے شباب کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ غیر ممکن تھا کہ ان دو متضاد مکاتیب خیال کے درمیان مصالحت کی کوئی صورت پیدا

۴۔ حضرت شبیرؑ کی جانب سے انکار بیعت یزید کی باطل قوتوں کے لیے کھلی دعوت مبارزت تھی۔ جب اہل کوفہ نے پیام وسلام کے ذریعہ حضرت حسینؑ کو اپنا امام اور مقتدا تسلیم کرنے کا عہد وپیمان باندھا۔ تو حضرت امام نے اس توقع پر کہ باطل کے مقابلہ میں حق کا محاذ تیار ہو جائیگا اہل کوفہ کی دعوت قبول فرمالی تاکہ ناناؐ کی جو امانت اہل باطل کے ہاتھوں تاراج ہو رہی تھی۔ ہمیشہ کے لئے اس کی حفاظت وصیانت کا انتظام ہو جائے چنانچہ عزیز واقارب، دوست احباب۔ ہمدرد وغمگسار سب کی مرضی کے خلاف آپ مدینۃ الرسول سے کوفہ کی جانب چل کھڑے ہوئے۔ لیکن راستہ میں جب حضرت مسلم بن عقیل کی شہادت اور پھر اہل کوفہ کی بیوفائی اور بدعہدی کی پیہم اطلاعیں ملیں اور دیکھا کہ حق کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں۔ تو دشمن کے نمائندوں کے سامنے تین تجویزیں پیش کیں۔ لیکن جب آپ کو نہ تو مدینہ واپس جانے کی اجازت دی گئی۔ نہ یزید کے پاس بھیجا گیا۔ اور نہ سرحدی علاقوں کی طرف آپ کے کوچ کو گوارا کیا گیا۔ تو امامؑ کے سامنے اب صرف دو صورتیں باقی رہ گئی تھیں —

— باطل کے ساتھ اعانت یا اثبات حق کے لئے اس سے تصادم ان میں سے صاحب بدر و حنین کے نواسے نے جو راہ اختیار کی۔ اس سے دنیا واقف ہے —

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل   یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردان خداست و خود آگاہ   یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

غرض امام ہمام نے نوک خنجر پر بھی حق و صداقت کے ساتھ وابستگی کا عزم فرمایا۔ اور جس حکومت کو آپ نے غیر اسلامی تصور فرمایا۔ بیعت کے ذریعہ اس کے ساتھ کسی اشتراک عمل پر بھی آمادگی ظاہر نہیں فرمائی۔ ادھر قدرت نے آپ کے عزم و ایقان کے لئے امتحان گاہ آراستہ کی ابتلاؤں اور آزمائشوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ وطن پاک جوار رسول سے ہجرت فرمائی راستہ میں ہمت شکن اطلاعوں کا تانتا بندھ گیا۔ ہمراہیوں، غمخواروں اور بہی خواہوں نے مراجعت کا مشورہ دیا۔ لیکن مسترد فرما دیا۔ قادسیہ کے مقام پر آپ کے اور حر بن تمیمی کے مابین ابن زیاد کے خط کے وصول ہونے تک آگے نہ بڑھنے کا عہد ہوتا ہے۔ ایسے میں طرماح بن عدی اور ان کے تین ساتھی کوفہ سے آتے ہیں۔ امام ان سے مل کر اہل کوفہ کی بابت سوال فرماتے ہیں جواب ملتا ہے "عوام کے دل آپ کے ساتھ ہیں۔ مگر ان کی تلواریں کل آپ کے خلاف نیام سے باہر نکلیں گی طرماح بن عدی مشورہ دیتے ہیں۔ ایک بالشت بھی آگے نہ بڑھیے میرے ساتھ چلے چلیے ہیں اپنے پہاڑ "آجا" میں آپ کو اتار دوں گا۔ قبیلہ طے کے

بیس ہزار بہادر تلواریں سے لیے آپ کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے واللہ جب تک ان کے دم میں دم رہے گا۔ آپ کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے گا۔ ہو سکتا تھا کہ جان کو خطرے میں دیکھ کر ایک انسان اس مشورہ کو قبول کر لیتا۔ لیکن امام نے شایان شان جواب دیا "خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ لیکن ہمارے اور حر کے درمیان ایک عہد ہو چکا ہے۔ ہم اس کی موجودگی میں ایک قدم نہیں اٹھا سکتے۔"

حرُ بن یزید کے استفسار کے جواب میں ابن زیاد نے حکم لکھ بھیجا "کہ حسین کو کہیں ٹکنے نہ دو کھلے میدان کے سوا کہیں اترنے نہ دو قلعہ بند یا شاداب مقام پر پڑاؤ نہ ڈال سکے۔" جب یہ حکم امام کو دیا گیا۔ تو آپ کے ساتھی زہیر بن القین نے عرض کی۔ "حر اور اس کے ساتھیوں سے لڑنا اس فوج گراں سے لڑنے کے مقابلہ میں کہیں آسان ہے جو بعد میں آئے گی" مگر آپ نے ان الفاظ کے ساتھ لڑنے سے انکار کر دیا "میں اپنی طرف سے لڑائی میں پہل کرنا نہیں چاہتا" حیرتناک استقلال اور ثبات قدم کے ساتھ خوف بجوع، نقص اموال۔ انفس والثمرات کے سارے ابتلاؤں سے گذرتے رہے۔ غنیم کی فوج کا دل بادل ہے۔ دھمکیوں پر دھمکیاں دیجا رہی ہیں مگر آپ مقام رضا و تسلیم پر اڑے ہیں۔ یہ منزل بھی گذر گئی۔ اب دھمکیوں نے عمل کی صورت اختیار کر لی۔ عباسؑ علمدار جیسے قوت بازو علی اکبرؑ جیسے جوان و شیر دل فرزند علی اصغرؑ جیسے معصوم اور دوسرے تمام حق پرست ساتھی ایک ایک کر کے جام شہادت نوش کر گئے۔ انجام کار

خود بھی دشمن کے مقابلہ میں جوہر شجاعت دکھا کر وجودِ حق پر اپنے خون سے شہادت ادا فرمائی ؎

چناں خود را نگہ داری کہ با ایں بے نیازیہا
شہادت بر وجودِ خود زخون دوستاں خواہی

۵۔ یزید کی نامزدگی نہ ہونے کی صورت میں قومی عصبیت کے انتشار اور نزاع و افتراق پیدا ہو جانے کا عذر بھی حق بجانب نہیں ہوسکتا۔ اس کا صرف اسی قدر جواب دیا جا سکتا ہے کہ اسلام کے مسلمہ اساسی اصولوں کو محض ہنگامی مصالح پر قربان کر دینا فقدانِ جرأت کا نتیجہ ہے اسلام زمانہ سازی نہیں بلکہ اس کے برخلاف "با زمانہ ستیز" کا درس دیتا ہے۔ اسلام نہ تو وقت کی پیداوار ہے۔ اور نہ وقت کا غلام۔ وقتی رجحانات و بدعات سے وہ کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا بلکہ ہر زمانے کی رہنمائی وقت کے غلط میلانات کا مقابلہ کرنا در اصل اسلام کا نصب العین ہے۔

حاصلِ کلام حادثہ کربلا اسلامی تاریخ کا جس قدر المناک واقعہ ہے۔ اسی قدر عبرتناک بھی ہے۔ جس کے اندر بڑی بڑی بصیرتیں پوشیدہ ہیں۔ جو طالبانِ حق اور متلاشیانِ صداقت کو دعوتِ فکر و عمل دیتی ہیں۔ یہ کتاب شہادت کے موضوع پر ایسے ہی چند معیاری مقالات کا مجموعہ ہے۔ جو ملک کے ممتاز اور مشاہیر اہلِ قلم کے نتائجِ فکر ہیں۔ ان میں سے ایک کے سوا جو حادثہ کربلا کی نہایت جامع اور

مکمل تاریخ ہے۔ دوسرے تمام مقالوں میں شہادت کے فلسفہ اس کے اعلیٰ اقدار اور بصائر وغیرہ کی شرح و تفسیر کی گئی ہے۔ اس موضوع پر اب تک اس قدر مستند اور بلند پایہ لٹریچر اکٹھا نہیں کیا گیا ہے توقع ہے کہ صاحبانِ ذوق سلیم نفیس اکیڈیمی کی اس کوشش کو استحسان اور قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ جس نے اب تک ہی فلسفہ عجم، فکر اقبال، اور حکمت اقبال جیسے بیش بہا مقالات کے مجموعے شائع کر کے اہل علم سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔

نیاز کیش

محمد عبد الرحمٰن سعید صدیقی

از

مولانا ابوالکلام آزاد

دنیا میں انسانی عظمت و شہرت کے ساتھ حقیقت کا توازن بہت کم قائم رہ سکتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جو شخصیتیں عظمت و تقدس اور قبول و شہرت کی بلندیوں پر پہونچ جاتی ہیں۔ دنیا عموماً تاریخ سے زیادہ افسانہ اور تخیل کے اندر انہیں ڈھونڈنا چاہتی ہے۔ اسی لئے فلسفہ تاریخ کے بانی اول ابن خلدون کو یہ قاعدہ بنا دینا پڑا کہ جو واقعہ دنیا میں جس قدر زیادہ مقبول و مشہور ہوگا۔ اتنی ہی افسانہ سرائی اسے اپنے حصار تخیل میں لے لیگی۔ ایک مغربی شاعر گوئٹے نے یہی حقیقت ایک دوسرے پیرایہ میں بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے انسانی عظمت کی حقیقت کی انتہا یہ ہے کہ افسانہ بن جائے۔

تاریخ اسلام میں حضرت امام حسین (علیہ و علی آباد و اجداد الصلوٰۃ والسلام) کی شخصیت جو اہمیت رکھتی ہے محتاج بیان

نہیں۔ خلفائے راشدین کے عہد کے بعد جس واقعہ نے اسلام کی دینی سیاسی اور اجتماعی تاریخ پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے وہ ان کی شہادت کا عظیم واقعہ ہے۔ بغیر کسی مبالغہ کے کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کے کسی المناک حادثہ پر نسل انسانی کے اس قدر آنسو نہ بہے ہوں گے۔ جس قدر اس حادثہ پر بہے ہیں۔ تیرہ سو برس کے اندر تیرہ سو محرم گذر چکے اور ہر محرم اس حادثہ کی یاد تازہ کرتا رہا۔ امام حسین کے جسم خونچکاں سے دشت کربلا میں جس قدر خون بہا تھا۔ اس کے ایک ایک قطرے کے بدلے دنیا اشک ہائے ماتم والم کا ایک سیلاب بہا چکی ہے۔

بایں ہمہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ تاریخ کا اتنا مشہور عظیم تاثیر رکھنے والا واقعہ بھی تاریخ سے کہیں زیادہ افسانہ کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اگر آج جویائے حقیقت چاہے کہ صرف تاریخ اور تاریخ کی محتاط شہادتوں کے اندر اس حادثہ کا مطالعہ کرے۔ تو اکثر صورتوں میں اسے مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس وقت جس قدر بھی مقبول اور متداول ذخیرہ اس موضوع پر موجود ہے وہ زیادہ تر روضہ خوانی سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کا مقصد زیادہ سے زیادہ گریہ وبکا کی حالت پیدا کردینی ہے۔ تاریخی حیثیت سے بیان واقعات بعض چیزیں جو تاریخ کی شکل میں مرتب ہوئی ہیں۔ وہ بھی دراصل تاریخ نہیں ہیں۔ روضہ خوانی اور مجلس

طرازی کے ہوا دی سے ایک دوسری صورت اختیار کر لی ہے۔

اگر آج جستجو کی جائے کہ دنیا کی کسی زبان میں بھی کوئی ایک کتاب ایسی موجود ہے۔ جو حادثہ کربلا کی تاریخ ہو۔ تو واقعہ یہ ہے کہ ایک بھی نہیں۔

ذیل میں ہم حضرت امام حسین علیہ والسلام کی شہادت کے واردات وحوادث نقل کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ اس سلسلہ سے مقصود تاریخی بحث ونظر نہیں ہے۔ بلکہ مجرد واقعات شہادت کا اس طرح یک جا کر دینا ہے کہ اس سے ایک مرتب سلسلہ بیان پیدا ہو جائے۔

تمہید اہل بیت، شروع سے اپنے تئیں خلافت کا زیادہ حقدار سمجھتے تھے۔ امیر معاویہؓ بن ابی سفیان کی وفات کے بعد تخت خلافت خالی ہوا۔ یزید بن معاویہؓ پہلے سے ولیعہد مقرر ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ اور حسین ابن علی علیہ السلام سے بھی بیعت کا مطالبہ کیا۔ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے کوفہ کو دار الخلافہ قرار دیا تھا۔ اس لئے وہاں اہل بیت کرام کے طرفداروں کی تعداد زیادہ تھی۔ انھوں نے حضرت حسینؓ کو لکھا کہ آپ تشریف لائیے۔ ہم آپ کا ساتھ دیں گے آپ نے اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیل کو اصل کوفہ

سے بیعت لینے کے لئے بھیجدیا۔ اور خود بھی سفر کی تیاری کرنے لگے

دوستوں کا مشورہ

آپ کے دوستوں اور عزیزوں کو معلوم ہوا تو سخت مضطرب ہوئے وہ اہل کوفہ کی بیوفائی اور زمانہ سازی سے واقف تھے۔ بنی امیہ کی سخت گیر طاقتوں سے بھی بے خبر نہ تھے۔ انہوں نے اس سفر کی مخالفت کی۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے کہا "لوگ یہ سن کر بڑے پریشان ہیں کہ آپ عراق جا رہے ہیں۔ مجھے اصلی حقیقت سے آگاہ کیجئے۔"

حضرت حسینؓ نے جواب دیا۔ "میں نے عزم کر لیا ہے۔ آج ہی کل میں روانہ ہوتا ہوں۔" ابن عباسؓ بے اختیار پکار اٹھے "خدا آپ کی حفاظت کرے۔ کیا آپ ایسے لوگوں میں جا رہے ہیں جنھوں نے اپنے امیر کو بے دست و پا کر دیا ہے۔ دشمن کو نکال دیا ہے اور ملک پر قبضہ حاصل کر لیا ہے۔ اگر وہ ایسا کر چکے ہیں۔ تو شوق سے تشریف لے جایئے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہوا ہے۔ حاکم بدستور ان کی گردن دبائے بیٹھا ہے۔ اس کے گماشتے برابر اپنی کارستانیاں کر رہے ہیں۔ تو ان کا آپ کو بلانا درحقیقت جنگ کی طرف بلانا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ آپ کو کہیں دھوکہ نہ دیں اور جب دشمن کو طاقتور دیکھیں۔ تو خود آپ سے لڑنے کے لئے آمادہ نہ ہو جائیں۔ مگر آپ اس طرح کی باتوں سے متاثر

نہ ہوئے اور اپنے ارادہ پر قائم رہے

ابن عباسؓ کا جوش

جب روانگی کی گھڑی بالکل قریب آگئی۔ تو ابن عباسؓ پھر دوڑے آئے "اے ابن عم" انھوں نے کہا" میں خاموش رہنا چاہتا تھا۔ مگر خاموش رہا نہیں جاتا۔ میں اس راہ میں آپ کی ہلاکت اور بربادی دیکھ رہا ہوں۔ عراق والے دغا باز ہیں۔ ان کے قریب بھی نہ جائیے یہیں قیام کیجئے۔ کیونکہ یہاں حجاز میں آپ سے بڑا کوئی نہیں ہے۔ اگر عراقی آپ کو بلاتے ہیں۔ تو ان سے کہئے کہ پہلے اپنے مخالفین کو اپنے علاقہ سے نکال دو پھر مجھے بلاؤ۔ اگر آپ حجاز سے جانا ہی چاہتے ہیں۔ تو یمن چلے جائیے۔ وہاں قلعے اور دشوار گذار پہاڑ ہیں۔ ملک کشادہ ہے۔ آبادی عموماً آپ کے والد کی خیرخواہ ہے۔ وہاں آپ ان لوگوں کے دسترس سے باہر ہوں گے۔ خطوں اور قاصدوں کے ذریعے آپ اپنی دعوت پھیلائیے۔ مجھے یقین ہے اس طرح آپ کامیاب ہو جائیں گے

لیکن حضرت حسینؑ نے جواب دیا۔

"اے ابن عم! میں جانتا ہوں تم میرے خیرخواہ ہو۔ لیکن اب میں عزم کر چکا۔"

ابن عباس نے کہا

"آپ نہیں مانتے تو عورتوں اور بچوں کو تو ساتھ نہ لے جائیے

مجھے اندیشہ ہے۔ آپ ان کی آنکھوں کے سامنے اسی طرح نہ قتل کرڈالے جائیں۔ جس طرح عثمان بن عفانؓ اپنے گھر والوں کے سامنے قتل کئے گئے تھے۔"

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد حضرت ابن عباسؓ نے جوش میں آکر کہا۔

"اگر مجھے یقین ہوتا کہ آپ کے بال پکڑ لینے اور لوگوں کے جمع ہونے سے آپ رک جائیں گے۔ تو واللہ میں ابھی آپ کی پیشانی کے بال پکڑ لوں۔"

(ابن جریر)

مگر آپ پھر بھی اپنے ارادہ پر قائم رہے

عبداللہ بن جعفر کا خط

اسی طرح اور بھی بہت سے لوگوں نے آپ کو سمجھایا۔ آپ کے چچیرے بھائی عبداللہ بن جعفر نے مدینے سے خط لکھا۔

"میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ یہ خط دیکھتے ہی اپنے ارادے سے باز آجایئے۔ کیونکہ اس راہ میں آپ کے لئے ہلاکت اور آپ کے اہل بیت کے لئے بربادی ہے۔ اگر آپ قتل ہو گئے تو زمین کا نور بجھ جائے گا۔ اس وقت ایک آپ ہی ہدایت کا نشان اور ارباب ایمان کی امیدوں کا مرکز ہیں۔ سفر میں جلدی نہ کیجئے میں آتا ہوں۔" (ابن جریر کامل مقتل ابن حنفہ وغیرہ ذالک)

والی کا خط

یہی نہیں بلکہ انھوں نے یزید کے مقرر کئے ہوئے والی عمرو بن سعد بن العاص سے جا کر کہا حسینؑ ابن علیؑ کو خط لکھ کر ہر طرح مطمئن کر دو" عمر نے کہا " آپ خود خط لکھ لائیے۔ میں مہر کر دوں گا۔ چنانچہ عبداللہ نے والی کی جانب سے یہ خط لکھا۔

میں دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو اس راستہ سے دور کر دے جس میں ہلاکت ہے اور اس راستہ کی طرف رہنمائی کرے۔ جس میں سلامتی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ عراق جا رہے ہیں۔

میں آپ کے لئے شقاق و اختلاف سے پناہ مانگتا ہوں۔ میں آپ کی ہلاکت سے ڈرتا ہوں میں عبداللہ بن جعفر اور یحییٰ بن سعید کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ ان کے ساتھ واپس چلے آیئے۔ میرے پاس آپ کے لئے امن۔ سلامتی نیکی۔ احسان اور حسن جوار ہے۔ خدا اس پر شاہد ہے وہی اس کا نگہبان اور کفیل ہے۔ والسلام

مگر آپ بدستور اپنے ارادے پر جمے رہے۔

(ابن جریر)

مکہ سے آپ عراق کو روانہ ہو گئے

فرزدق سے ملاقات

صفاح نام مقام پر مشہور محب اہل بیت شاعر فرزدق سے ملاقات ہوئی۔

آپ نے پوچھا "تیرے پیچھے لوگوں کا کیا حال ہے"؟

فرزدق نے جواب دیا۔ "ان کے دل آپ کے ساتھ ہیں۔ مگر تلواریں بنی امیہ کے ساتھ ہیں" فرمایا "سچ کہتا ہے اب معاملہ اللہ ہی کے ہاتھ ہے وہ جو چاہتا ہے۔ وہی ہوتا ہے۔ ہمارا پروردگار ہر لمحہ کسی نہ کسی حکم فرمائی میں ہے۔ اگر اس کی مشیت ہماری پسند کے مطابق ہو تو اس کی ستائش کریں گے۔ اگر امید کے خلاف ہو تو بھی نیک نیتی اور تقویٰ کا ثواب کہیں نہیں گیا ہے۔"

یہ کہا اور سواری آگے بڑھائی

(ابن جریر)

مسلم بن عقیل کے عزیزوں کی ضد

زرود نام مقام میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ آپ کے نائب مسلم بن عقیل کو کوفہ میں یزید کے گورنر عبید اللہ بن زیاد نے علانیہ قتل کر دیا۔ اور کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی آپ نے سنا تو بار بار (انا للہ و انا الیہ راجعون) پڑھنا شروع کیا۔ بعض ساتھیوں نے کہا۔

اب بھی وقت ہے۔ ہم آپ کے اور آپ کے اہل بیت کے

معاملہ میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتے ہیں۔ للّٰہ یہیں سے لوٹ چلیے کوفہ میں آپ کا کوئی اورطرف دار اور مددگار نہیں ہے۔ سب آپ کے خلاف کھڑے ہوجائیں گے۔

آپ خاموش کھڑے ہوگئے اور واپسی پر غور کرنے لگے۔ لیکن مسلم بن عقیل کے عزیز کھڑے ہوگئے۔ "واللّٰہ ہم ہرگز نہ ٹلیں گے" انھوں نے کہا "ہم اپنا انتقام لیں گے یا اپنے بھائی کی طرح مرجائیں گے۔" اس پر آپ نے ساتھیوں کو نظر اٹھاکر دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ان کے بعد زندگی کا کوئی مزہ نہیں۔"

(ابن جریر)

راستہ میں بھیڑ چھٹ گئی

بدوؤں کی ایک جماعت آپ کے ساتھ ہوگئی تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کوفہ میں خوب آرام کریں گے۔ آپ ان کی حقیقت سے خوب واقف تھے۔ سب لوگوں کو جمع کرکے خطبہ دیا۔

"اے لوگو! ہمیں نہایت وحشت ناک خبریں پہونچی ہیں۔ مسلم بن عقیل ہانی بن عروہ اور عبداللّٰہ بن لقطر قتل کرڈالے گئے۔ ہمارے طرف داروں نے بے وفائی کی۔ کوفہ میں ہمارا کوئی مددگار نہیں جو ہمارا ساتھ چھوڑنا چاہے چھوڑ دے۔ ہم ہرگز خفا نہ ہوں گے۔"

یہ سن کر بھیڑ دائیں بائیں کٹنا شروع ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد آپ کے گرد وہی آدمی رہ گئے۔ جو مکہ سے آپ کے ساتھ

چلے تھے۔ (ابن جریر)

حُر بن یزید کی آمد

قادسیہ سے جوں ہی آگے بڑھے عبیداللہ بن زیاد والی عراق کے عامل حصین بن امیر تمیمی کی طرف سے حُر بن یزید ایک ہزار فوج کے ساتھ نمودار ہوا۔ اور ساتھ ہو لیا۔ اسے حکم ملا تھا۔ کہ حضرت حسینؓ کے ساتھ برابر لگا رہے۔ اور اس وقت تک پیچھا نہ چھوڑے۔ جب تک انہیں عبیداللہ بن زیاد کے روبرو نہ لے جائے۔ اسی اثنا میں نماز ظہر کا وقت آگیا۔ آپ تہہ بند باندھے چادر اوڑھے نعلین پہنے تشریف لائے۔ اور حمد و نعت کے بعد اپنے ساتھیوں اور حُر کے سپاہیوں کے سامنے خطبہ دیا۔

راہ میں ایک خطبہ

"اے لوگو! خدا کے سامنے اور تمہارے سامنے میرا یہ عذر ہے کہ میں اپنی طرف سے یہاں نہیں آیا ہوں۔ میرے پاس تمہارے خطوط پہنچے قاصد آئے۔ مجھے بار بار دعوت دی گئی کہ ہمارا کوئی امام نہیں، آپ آیئے تاکہ خدا ہمیں آپ کے ہاتھ پر جمع کر دے۔ اگر اب بھی تمہاری یہ حالت ہے۔ تو میں آگیا ہوں۔ اگر مجھے عہد و پیمان کرنے کے لئے ہو۔ جن پر میں مطمئن ہو جاؤں۔ تو میں تمہارے شہر چلنے کو تیار ہوں۔ اگر ایسا نہیں ہے۔ بلکہ تم میری آمد سے ناخوش ہو تو میں وہیں واپس چلا جاؤں گا۔ جہاں سے آیا ہوں۔"

دشمنوں نے آپ کے پیچھے نماز پڑھی

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ دیر تک خاموش رہنے کے بعد لوگ موذن سے کہنے لگے " اقامت پکارو"

حضرت حسینؑ نے حر بن یزید سے کہا " کیا تم علیحدہ نماز پڑھو گے؟"
اس نے کہا۔ " نہیں آپ امامت کریں۔ ہم آپ ہی پیچھے نماز پڑھیں گے۔"

وہیں عصر کی بھی نماز پڑھی۔ دوست دشمن سب مقتدی تھے نماز کے بعد آپ نے پھر خطبہ دیا۔

دوسرا خطبہ

" اے لوگو! اگر تم تقویٰ پر رہو۔ اور حقدار کا حق پہچانو تو خدا کی خوشنودی کا موجب ہوگا۔ ہم اہلِ بیت ان مدعیوں سے زیادہ حکومت کے حقدار ہیں۔ ان لوگوں کو کوئی حق نہیں پہونچتا۔ یہ تم پر ظلم و جور سے حکومت کرتے ہیں۔ لیکن اگر تم ہمیں ناپسند کرو۔ ہمارا فرض پہچانو اور تمھاری رائے اب اس کے خلاف ہو گئی ہو جو تم نے مجھے اپنے خطوں میں لکھی اور قاصدوں کی زبانی پہونچائی تھی۔ تو میں واپس چلے جانے کے لئے بخوشی تیار ہوں۔"

اہلِ کوفہ کے خطوط

اس پر حر نے کہا " آپ کن خطوط کا ذکر کرتے ہیں۔ ہمیں ایسے خطوں کا

کوئی علم نہیں۔"

آپ نے عقبہ بن سمعان کو حکم دیا کہ وہ "دونوں تھیلے نکال لائے۔ جن میں کوفہ والوں کے خطوط بھرے ہیں" عقبہ نے تھیلے انڈیل دیئے اور خطوں کا ڈھیر لگا دیا۔ اس پر حُر نے کہا۔ لیکن ہم وہ نہیں ہیں جنھوں نے یہ خطوط لکھے تھے۔ ہمیں تو یہ حکم ملا ہے کہ آپ کو عبیداللہ بن زیاد تک پہنچا کے چھوڑیں۔"

حضرت امام حسینؑ نے فرمایا۔ " لیکن یہ موت سے پہلے ناممکن ہے۔"

پھر آپ نے روانگی کا حکم دیا۔ لیکن مخالفین نے راستہ روک لیا۔ آپ نے خفا ہو کر حُر سے کہا" تیری ماں تجھے روئے۔ تو کیا چاہتا ہے۔؟"

حُر نے جواب دیا" واللہ اگر آپ کے سوا کوئی اور عرب میری ماں کا نام زبان پر لاتا۔ تو میں اسے بتا دیتا۔ لیکن آپ کی ماں کا ذکر میری زبان پر برائی کے ساتھ نہیں آسکتا۔"

آپ نے فرمایا۔" پھر تم کیا چاہتے ہو۔؟"

اس نے کہا" میں آپ کو عبیداللہ بن زیاد کے پاس لے جانا چاہتا ہوں۔" آپ نے فرمایا" تو واللہ میں تمہارے ساتھ نہیں چلوں گا۔"

اس نے کہا۔" میں بھی آپ کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔"

جب گفتگو زیادہ بڑھی تو حر نے کہا۔ "مجھے آپ سے لڑنے کا حکم نہیں ملا ہے۔ مجھے صرف یہ حکم ملا ہے کہ آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں۔ یہاں تک کہ آپ کو کوفہ پہونچا دوں۔ اگر آپ اسے منظور نہیں کرتے۔ تو ایسا راستہ اختیار کیجئے۔ جو نہ کوفہ جاتا ہو نہ مدینہ میں ابن زیاد کو لکھتا ہوں۔ آپ اگر پسند کریں تو خود بھی یزید یا عبید اللہ کو لکھئے۔ شاید خدا میرے لئے مخلصی کی کوئی صورت پیدا کر دے۔ اور آپ کے معاملہ میں امتحان سے بچ جاؤں"

یہ بات آپ نے منظور کرلی۔ اور روانہ ہو گئے

(ترجمہ ذکامل)

ایک اور خطبہ

راستہ میں کئی اور مقامات پر بھی آپ نے دوستوں اور دشمنوں کو مخاطب کیا مقام بیضہ پر آپ نے خطبہ دیا۔

" اے لوگو! رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ جو کوئی ایسے حاکم کو دیکھے۔ جو ظلم کرتا ہے۔ خدا کی قائم کی ہوئی حدیں توڑتا ہے۔ عہد الٰہی شکست کرتا ہے۔ سنت نبویؐ کی مخالفت کرتا ہے۔ خدا کے بندوں پر گناہ اور سرکشی سے حکومت اور دیکھنے پر بھی نہ تو اپنے فعل سے اس کی مخالفت کرتا ہے اور نہ اپنے قول سے۔ سو خدا ایسے آدمی کو اچھا ٹھکانہ نہیں بخشے گا۔ دیکھو یہ لوگ شیطان کے پیرو بن گئے۔ رحمان

سے سرکش ہو گئے ہیں۔ فساد ظاہر ہے۔ حدود الٰہی معطل ہو کر مال غنیمت پر ناجائز قبضہ ہے۔ خدا کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرایا جا رہا ہے۔ میں ان کی سرکشی کو حق و عدل سے بدل دینے کا سب سے زیادہ حقدار ہوں۔ تمہارے بے شمار خطوط اور قاصد میرے پاس پیام بیعت لے کر پہنچے تم عہد کر چکے ہو کہ نہ تو تم مجھ سے بے وفائی کرو گے۔ نہ مجھے دشمنوں کے حوالے کرو گے۔ اگر تم اپنی بیعت پر قائم رہو۔ تو یہ تمہارے لئے راہِ ہدایت ہے۔ کیونکہ میں حسینؓ ابن علیؓ ابن فاطمہؓ رسول اللہ کا نواسہ ہوں۔ میری جان تمہاری جان کے ساتھ ہے۔ میرے بال بچے تمہارے بال بچوں کے ساتھ ہیں۔ مجھے اپنا نمونہ بناؤ۔ اور مجھ سے گردن نہ موڑو۔ لیکن اگر تم یہ نہ کرو۔ بلکہ اپنا عہد توڑ دو اور اپنی گردن سے بیعت کا حلقہ نکال پھینکو۔ تو یہ بھی تم سے بعید نہیں۔

تم میرے باپ بھائی اور عم زاد مسلم سے ایسا ہی کر چکے ہو۔ وہ فریب خوردہ ہے۔ جو تم پر بھروسہ کرے۔ لیکن یاد رکھو تم نے اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ اور اب بھی اپنا ہی نقصان کرو گے تم نے اپنا ہی حصہ کھو دیا۔ اپنی قسمت بگاڑ دی۔ جو بد عہدی کرے گا خود اپنے خلاف بد عہدی کرے گا۔ عجب نہیں خدا عنقریب مجھے تم سے بے نیاز کر دے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ (ابن جریر اور کامل)

ایک اور تقریر

ایک دوسری جگہ یوں تقریر فرمائی۔ "معاملہ کی جو صورت ہو گئی ہے۔ تم دیکھ رہے ہو۔ دنیا نے اپنا رنگ بدل دیا۔ منہ پھیر لیا۔ نیکی سے خالی ہو گئی۔ ذرا سی تلچھٹ باقی ہے۔ حقیر سی زندگی رہ گئی ہے۔ ہولناکی نے احاطہ کر لیا ہے۔ افسوس دیکھتے نہیں حق پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔ باطل پر علانیہ عمل کیا جا رہا ہے کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ پکڑے۔ وقت آ گیا ہے کہ مومن حق کی راہ میں لقاء الٰہی کی خواہش کرے۔ لیکن میں شہادت ہی کی موت چاہتا ہوں۔ ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بجائے خود ایک جرم ہے۔"

زہیر کا جواب

یہ خطبہ سن کر زہیر بن القین البجلی نے کھڑے ہو کر لوگوں سے کہا۔ "تم لوگ بولو گے یا میں بولوں؟"

سب نے کہا "تم بولو!" زہیر نے تقریر کی

"اے فرزند رسول! خدا آپ کے ساتھ ہو! ہم نے آپ کی تقریر سنی۔ واللہ اگر دنیا ہمارے لئے ہمیشہ باقی رہنے والی ہو۔ اور ہم سدا اس میں رہنے والے ہوں۔ جب بھی آپ کی حمایت و نصرت کے لئے اس کی جدائی گوارا کر لیں گے۔ اور ہمیشہ کی زندگی پر آپ کے ساتھ مر جانے کو ترجیح دیں گے۔" (ابن جریر اور کامل)

حُر کی دھمکی کا جواب

حُر بن یزید آپ کے ساتھ برابر چلا آرہا تھا۔ بار بار کہتا تھا "اے حسینؓ! اپنے معاملہ میں خدا کو یاد کیجئے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اگر آپ جنگ کریں گے۔ تو ضرور قتل کر ڈالے جائیں گے۔"

ایک مرتبہ آپ نے غضبناک ہو کر فرمایا۔ "تو مجھے موت سے ڈراتا ہے۔ کیا تمہاری شقاوت اس حد تک پہونچ جائیگی کہ مجھے قتل کر دو گے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ تجھے کیا جواب دوں! لیکن میں وہی کہوں گا جو رسول اللہؐ کے ایک صحابیؓ نے جہاد پر جاتے ہوئے اپنے بھائی کی دھمکی سن کر کہا تھا۔

میں روانہ ہوتا ہوں۔ مرد کے لئے موت، ذلت نہیں ہے۔ جب کہ اس کی نیت نیک ہو اور اسلام کی راہ میں جہاد کرنے والا ہو۔

اور جب کہ وہ اپنی جان دے کر صالحین کا مددگار ہو۔ اور دغاباز ظالم ہلاک ہونے والے سے جدا ہو رہا ہو۔ (ابن جریر و کامل)

چار کوفیوں کی آمد

عذیب الہجانات نام مقام پر کوفہ سے چار سوار آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان کے آگے آگے طرماح بن عدی یہ شعر پڑھ رہا تھا

اے میری اونٹنی! میری ڈانٹ سے ڈر نہیں

طلوعِ فجر سے پہلے ہمت سے چل،)
سب سے اچھے مسافروں کو لے چل۔ سب سے اچھے
سفر پر چل۔ یہاں تک کہ شریف النسب آدمی تک
پہونچ جا)

وہ عزت والا ہے۔ آزاد ہے۔ فراخ سینہ ہے
اللہ اسے سب سے اچھے کام کے لئے لایا ہے)

حضرت حسین نے یہ شعر سنا۔ تو فرمایا۔ "واللہ مجھے بھی امید ہے کہ خدا کو ہمارے لئے بھلائی منظور ہے۔ چاہے قتل ہوں۔ یا فتحیاب ہوں۔"

حُر بن یزید نے ان لوگوں کو دیکھا۔ تو حضرت سے کہا۔ "یہ لوگ کوفے کے ہیں۔ آپ کے ساتھی نہیں ہیں۔ میں انھیں روکوں گا۔ واپس کر دوں گا۔"

آپ نے فرمایا کہ تم وعدہ کر چکے ہو۔ کہ ابن زیاد کا خط آنے سے پہلے مجھ سے کوئی تعرض نہیں کروگے۔ یہ اگرچہ میرے ساتھ نہیں آئے۔ لیکن میرے ہی ساتھی ہیں۔ اگر ان سے چھیڑ چھاڑ کروگے۔ تو میں تم سے لڑوں گا۔" یہ سُن کر حُر خاموش ہو گیا۔

کوفہ والوں کی حالت

آنے والوں سے آپ نے پوچھا۔ لوگوں کو کس حال

میں چھوڑ آئے ہو!" انھوں نے جواب دیا "شہر کے سرداروں کو رشوتیں دے کر ملا لیا گیا ہے۔ عوام کے دل آپ کے ساتھ ہیں مگر ان کی تلواریں کل آپ کے خلاف نیام سے باہر نکلیں گی۔"
(ابن جریر و کامل)

آپ کے قاصد کا قتل

اس سے پہلے آپ قیس بن مُسہر کو بطور قاصد کوفہ بھیج چکے تھے عبیداللہ بن زیاد نے انھیں قتل کر ڈالا تھا۔ مگر آپ کو اس کی اطلاع نہ تھی۔ ان لوگوں سے قاصد کا حال پوچھا۔ انھوں نے سارا واقعہ بیان کیا۔ آپ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور فرمایا (منھم من قضٰی نحبہ ومنھم من ینتظر وما بدلو تبدیلا) بعض ان میں سے مر چکے ہیں۔ اور بعض موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر حق پر ثابت قدم ہیں۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے)
خدایا ہمارے لئے اور ان کے لئے جنت کی راہ کھول دے۔ اپنی رحمت اور ثواب کے دارالقرار میں ہمیں اور انھیں جمع کر۔"

طرماح بن عدی کا مشورہ

طرماح بن عدی نے کہا۔ "واللہ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر

دیکھ رہا ہوں۔ مگر آپ کے ساتھ کوئی آدمی دکھائی نہیں دیتا۔ اگر صرف یہی لوگ ٹوٹ پڑیں۔ جو آپ کے پیچھے لگے ہیں۔ تو خاتمہ ہو جائے۔ میں نے جتنا بڑا انبوہ آدمیوں کا کوفہ کے عقب میں دیکھا ہے۔ اتنا کسی مقام پر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ سب اس لئے جمع کئے گئے ہیں۔ کہ امام حسینؑ سے لڑیں۔ میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ اگر ممکن ہو تو ایک بالشت بھی آگے نہ بڑھیے اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایسی جگہ پہونچ جائیں جہاں دشمنوں سے بالکل امن ہو۔ تو میرے ساتھ چلے چلیئے۔ میں اپنے پہاڑ "آجا" میں آپ کو اتاروں گا۔ واللہ وہاں دس دن بھی نہ گذریں گے۔ کہ قبیلہ طے کے بیس ہزار بہادر تلواریں لئے آپ کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔ واللہ جب تک ان کے دم میں دم رہیگا۔ آپ کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے گا۔"

آپ نے جواب دیا۔

خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ لیکن ہمارے اور ان کے مابین ایک عہد ہو چکا ہے۔ ہم اس کی موجودگی میں ایک قدم نہیں اٹھا سکتے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہمارا ان کا معاملہ کس حد پر پہونچ کر ختم ہوگا۔ (ابن جریر و کامل)

خواب اب آپ کو یقین ہو چلا تھا کہ موت کی طرف جا رہے ہیں۔ "قصرِ بنی مقاتل" نامی مقام

سے کوچ کرتے وقت آپ اونگھ گئے تھے۔ پھر چونک کر باآواز بلند کہنے لگے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ الحمد للہ رب العالمین تین مرتبہ یہی فرمایا۔ آپ کے صاحبزادے علی اکبر نے عرض کیا۔ یہ انا للہ اور الحمد للہ کیوں۔؟

فرمایا "جان پدر! ابھی اونگھ گیا تھا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سوار کہتا چلا جا رہا ہے" لوگ چلتے ہیں اور موت ان کے ساتھ چلتی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ہماری موت کی خبر ہے۔ جو ہم کو سنائی جا رہی ہے"

علی اکبر نے کہا۔ "خدا آپ کو روز بد نہ دکھلائے! کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔؟" فرمایا۔ بے شک ہم حق پر ہیں۔" اس پر وہ تو بے اختیار پکار اٹھے۔ "اگر ہم حق پر ہیں، تو پھر ہمیں موت کی کوئی پرواہ نہیں۔"

یہی وہ آپ کے صاحبزادے ہیں۔ جو میدان کربلا میں شہید ہوئے اور علی الاکبر کے لقب سے مشہور ہیں۔

(ابن جریر، شرح نہج البلاغہ امالی سید مرتضی وغیرہ ذالک)

ابن زیاد کا خط

صبح آپ پھر سوار ہوئے اپنے ساتھیوں کو پھیلانا شروع کیا۔ مگر حر بن یزید انھیں پھیلنے سے روکتا تھا۔ باہم دیر تک کشمکش جاری رہی۔ آخر کوفہ کی طرف سے ایک سوار آتا دکھائی دیا۔ یہ ہتھیار بند تھا۔

حضرت حسین کی طرف سے اس نے منہ پھیر لیا۔ مگر حرؑ کو سلام کیا اور ابن زیاد کا خط پیش کیا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

حسینؑ کو کہیں ٹکنے نہ دو۔ کھلے میدان کے سوا کہیں اترنے نہ دو۔ قلعہ بند شاداب مقام میں پڑاؤ نہ ڈال سکے۔ میرا ایلچی قاصد تمہارے ساتھ رہیگا اور دیکھتا رہے گا کہ تم کہاں تک میرے حکم کی تعمیل کرتے ہو۔"

حر نے خط کے مضمون سے حضرت امام کو آگاہ کیا۔ اور کہا کہ اب میں مجبور ہوں۔ آپ کو بے آب وگیاہ کھلے میدان میں ہی اترنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔

زہیر القین نے حضرت سے عرض کیا۔" ان لوگوں سے لڑنا اس فوج گراں سے لڑنے کے مقابلہ میں کہیں آسان ہے۔ جو بعد میں آئے گی۔"

مگر آپ نے لڑنے سے انکار کر دیا" میں اپنی طرف سے لڑائی میں پہل نہیں کرنا چاہتا۔" زہیر نے کہا۔ تو پھر اس سامنے کے گاؤں میں چل کر اترئیے۔ جو فرات کے کنارے ہے۔ اور قلعہ بند ہو جانا چاہیئے۔"

آپ نے پوچھا" اس کا نام کیا ہے؟ زہیر نے کہا "عقر" (عقر کے معنی ہیں کاٹنا۔ یا بے ثمر و نتیجہ ہونا) یہ سن کر آپ منغض ہو گئے

اور کہا "عقر سے خدا کی پناہ!"

(ابن جریر و کامل)

کربلا میں ورود آخر ۲ محرم الحرام سنہ ۶۱ھ کو آپ ایک اجاڑ سرزمین پر پہونچ کر اتر پڑے: پوچھا اس سرزمین کا نام کیا ہے؟" معلوم ہوا "کربلا"۔ آپ نے فرمایا یہ کرب اور بلا ہے۔ یہ مقام دریا سے دور تھا۔ دریا اور اس میں ایک پہاڑی حائل تھی۔

(الامۃ والسیاسۃ)

عمر بن سعد کی آمد دوسرے دن عمر بن سعد بن ابی وقاص، کوفہ والوں کی چار ہزار فوج لے کر آ پہنچا عبید اللہ بن زیاد نے عمر کو زبردستی بھیجا تھا۔ عمر کی خواہش تھی۔ کہ کسی طرح اس امتحان سے بچ نکلے۔ اور معاملہ رفع دفع ہو جائے۔ اس نے آتے ہی حضرت حسینؑ کے پاس قاصد بھیجا۔ اور دریافت کیا۔ آپ کیوں تشریف لائے؟ آپ نے وہی جواب دیا۔ جو حر بن یزید کو دے چکے تھے۔ "تمہارے اس شہر کے لوگوں ہی نے مجھے بلایا ہے۔ اب اگر وہ مجھے ناپسند کرتے ہیں۔ تو میں لوٹ جانے کے لئے تیار ہوں۔"

ابن زیاد کی سختی عمر بن سعد کو اس جواب سے خوشی ہوئی اور امید بندھی کہ یہ مصیبت ٹل جائے گی

چنانچہ عبیداللہ بن زیاد کو خط لکھا۔ خط پڑھ کر ابن زیاد نے کہا۔

اب ہمارے پنجہ میں آپھنسا ہے۔ چاہتا ہے کہ نجات پائے۔ مگر اب واپسی اور نکل بھاگنے کا وقت نہیں رہا۔

پھر جواب لکھوایا۔

حسین سے کہو پہلے سے اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ یزید بن معاویہ کی بیعت کریں۔ پھر ہم دیکھیں گے۔ ہمیں کیا کرنا ہے۔ حسین اور ان کے ساتھیوں تک پانی نہ پہونچنے پائے۔ وہ پانی کا ایک قطرہ بھی پینے نہ پائیں۔ جس طرح عثمان بن عفانؓ پانی سے محروم تھے۔

پانی پر تصادم

عمر بن سعد نے مجبوراً پانسو سپاہی گھاٹ کی حفاظت کے لئے بھیجدیئے۔ آپ اور آپ کے ساتھیوں پر پانی بند ہو گیا۔ اس پر آپ نے اپنے بھائی عباس بن علی کو حکم دیا۔ کہ تیس سوار اور بیس پیادے لے کر جائیں اور پانی بھر لائیں۔ یہ پہونچے تو محافظ دستے کے افسر عمرو بن الحجاج نے روکا۔ باہم مقابلہ ہوا۔ لیکن آپ بیس مشکیں پانی کی بھر لائے۔

....

عمرو بن سعد سے ملاقات شام کو حضرت حسینؓ نے عمرو بن سعد کو کہلا بھیجا کہ آج رات مجھ سے ملاقات کرو۔ چنانچہ دونوں بیس بیس سوار لے کر اپنے اپنے پڑاؤ سے نکلے اور درمیانی مقام میں ملے۔ تخلیہ میں بہت رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں۔ روای کہتا ہے کہ گفتگو بالکل خفیہ تھی۔ لیکن لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ حضرت امامؓ نے عمر سے کہا کہ "ہم تم دونوں اپنے اپنے لشکر یہیں چھوڑ کر یزید کے پاس روانہ ہو جائیں" عمر نے کہا۔ "اگر میں ایسا کروں گا۔ تو میرا گھر کھدوا ڈالا جائے گا"

آپ نے فرمایا۔ "میں بنا دوں گا" عمر نے کہا۔ "میری تمام جائیداد ضبط کر لی جائے گی"

آپ نے فرمایا۔ "میں اپنی حجاز کی جائیداد سے اس کا معاوضہ دے دوں گا۔ مگر عمر نے منظور نہیں کیا۔

(ابن جریر وغیرہ)

تین شرطیں اس کے بعد کئی تین چار مرتبہ باہم ملاقاتیں ہوئیں۔ آپ نے تین صورتیں پیش کیں۔

(۱) مجھے واپس لوٹ جانے دو۔ جہاں سے آیا ہوں

(۲) مجھے یزید سے اپنا معاملہ طے کر لینے دو

(۳) مجھے مسلمانوں کی کسی سرحد پر بھیج دو۔ وہاں کے لوگوں پر

جو گذرنی ہے۔ وہ مجھ پر گذرے گی۔

عمر کا خط :-

بار بار کی گفتگو کے بعد عمر بن سعد نے ابن زیاد کو خط لکھا۔

خدا نے فتنہ ٹھنڈا کر دیا۔ پھوٹ دور کر دی اتفاق پیدا کر دیا۔ امت کا معاملہ درست کر دیا حسینؑ مجھ سے وعدہ کر گئے ہیں۔ کہ وہ ان تین صورتوں میں سے کسی ایک کے لئے تیار ہیں۔ اس میں تمہارے لئے بھی بھلائی ہے اور امت کے لئے بھی بھلائی ہے۔

شمر کی مخالفت

ابن زیاد نے خط پڑھا۔ تو متاثر ہو گیا عمر بن سعد کی تعریف کی اور کہا: میں نے منظور کیا۔ مگر شمر بن ذی الجوشن نے مخالفت کی اور کہا۔ "اب کے حسینؑ قبضہ میں آ چکے ہیں۔ اگر آپ کی اطاعت کے بغیر نکل گئے۔ تو عجب نہیں عزت و قوت حاصل کر لیں۔ اور آپ کمزور و عاجز قرار پائیں۔ بہتر یہی ہے کہ اب انھیں قابو سے نکلنے نہ دیا جائے جب تک وہ آپ کی اطاعت نہ کر لیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ حسین اور عمر رات رات بھر باہم سرگوشیاں کیا کرتے ہیں۔"

ابن زیاد کا جواب

ابن زیاد نے یہ رائے پسند کر لی اور شمر کو خط دیکر بھیجا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

"کہ اگر حسین معہ اپنے ساتھیوں کے اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دیں۔ تو لڑائی نہ لڑی جائے۔ اور انہیں صحیح سالم میرے پاس بھیجدیا جائے۔ لیکن اگر یہ بات وہ منظور نہ کریں۔ تو پھر جنگ کے سوا چارہ نہیں۔ شمر سے کہدیا ہے۔ کہ اگر عمر بن سعد نے میرے حکم پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا۔ جب تو تم اسکی اطاعت کرنا۔ ورنہ چاہیئے کہ اسے ہٹا کر خود فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لینا۔ اور حسین کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیجدینا۔"

ابن زیاد کے اس خط میں عمر و کو یہ سخت تہدید بھی کی گئی تھی۔ کہ میں نے تمہیں اس لئے نہیں بھیجا ہے۔ کہ حسین کو بچاؤ۔ اور میرے پاس سفارشیں بھیجو۔ دیکھو میرا حکم صاف ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو حوالے کردیں۔ تو صحیح سالم میرے پاس بھیجدو۔ لیکن اگر انکار کریں۔ تو بے تامل حملہ کردو۔ خون بہاؤ لاش بگاڑو۔ کیونکہ وہ اسی کے مستحق ہیں۔ قتل کے بعد ان کی لاش گھوڑوں سے روندڈالنا۔ کیونکہ وہ باغی ہیں۔ اور جماعت سے نکل گئے ہیں۔ میں نے عہد کرلیا ہے کہ اگر قتل کروں گا۔ تو یہ ضرور کروں گا۔

اگر تم نے میرے حکم کی تعمیل کی تو انعام و اکرام کے مستحق ہوگے اور اگر نافرمانی کی تو معزول کئے جاؤ گے۔

(ابن جریر)

شمر بن ذی الجوشن اور حضرت حسینؑ

شمر بن ذی الجوشن کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کی پھوپی ام البنین بنت خرام امیر المومنین علی علیہ السلام کی زوجیت میں تھیں۔ اور انھیں کے بطن سے چار صاحبزادے عباس عبداللہ جعفر اور عثمان پیدا ہوئے تھے۔ جو اس معرکہ میں امام حسینؑ کے ساتھ تھے۔ اس طرح شمر ان چاروں کا ان کے واسطے سے حضرت امام کا بھی پھیرا بھائی تھا۔ اس نے ابن زیاد سے درخواست کی تھی کہ اس کے ان عزیزوں کو امان دے دی جائے۔ اور اس نے منظور کر لیا تھا۔ چنانچہ اس نے میدان میں چاروں صاحبزادوں کو بلا کر کہا "تم میرے دادھیالی ہو۔ تمہارے لئے میں نے امن وسلامتی کا سامان کر لیا ہے۔"

لیکن انھوں نے جواب دیا "افسوس تم پر، تم ہمیں تو امان دیتے ہو لیکن فرزندانِ رسول اللہ کے لئے امان نہیں ہے۔"

شمر نے ابن سعد کو حاکم کوفہ کا خط پہونچا دیا۔ اور وہ طوعاً وکرہاً بخوف عزل آمادہ تعمیل ہو گیا۔

(ابن جریر)

فوج کی ابتدائی حرکت

نماز عصر کے بعد عمر بن سعد نے اپنے لشکر کو حرکت دی۔ جب قریب پہنچا۔ تو حضرت عباس بیس سواروں کے ساتھ نمودار ہوئے

عمر نے ان سے کہا کہ ابن زیاد کا جواب آ گیا ہے۔ اور اس کا مضمون یہ ہے۔

حضرت عباس واپس لوٹے کہ حضرت حسینؑ کو اس کی اطلاع دیں۔ اس اثنار میں فریقین کے بعض پرجوش آدمیوں میں جو ردوکد ہوئی۔ اسے راویوں نے محفوظ رکھا ہے۔

دونوں فوجوں میں زبانی ردوکد

حضرت امامؑ کے طرفداروں میں سے حبیب ابن مظاہر نے کہا کہ "خدا کی نظر میں بدترین لوگ وہ ہوں گے۔ جو اس کے حضور اس حالت میں پہنچیں گے۔ کہ اس کے نبی کی اولاد اور اس کے شہر (کوفہ) کو تہجد گزار عابدوں کے خون سے ان کا ہاتھ رنگین ہوگا۔"

ابن سعد کی فوج میں سے عزرہ بن قیس نے جواب دیا "شاباش اپنی خوب بڑائی کرو۔ پیٹ بھر کے اپنی پاکی کا اعلان کرو" زہیر بن القین نے کہا۔ "اے عزرہ! خدا ہی نے ان نفسوں کو پاک کر دیا ہے۔ اور ہدایت کی راہ دکھائی ہے۔ خدا سے ڈر اور ان پاک نفسوں کے قتل میں گمراہی کا مددگار نہ بن۔"

عزرہ نے جواب دیا۔ "زہیر! تم تو اس خاندان کے حامی نہ تھے۔ کیا آج سے پہلے تم عثمانی (حضرت عثمانؓ کے حامی) نہ تھے؟"

زہیر نے کہا۔" ہاں یہ سچ ہے۔ میں نے حسینؑ کو کبھی کوئی خط نہیں لکھا۔ نہ کبھی کوئی قاصد بھیجا۔ لیکن سفر نے ہم دونوں کو یکجا کر دیا ہے میں نے انھیں دیکھا تو رسول اللہ یاد آ گئے۔ رسول اللہ کی ان سے محبت یاد آ گئی۔ میں نے دیکھا یہ کتنے قوی دشمن کے سامنے جا رہے ہیں۔ خدا نے میرے دل میں ان کی محبت ڈال دی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں ان کی مدد کروں گا۔ اور اللہ اور اس کے رسول کے اس حق کی حفاظت کروں گا۔ جسے تم نے ضائع کر دیا ہے

امام حسین کو جب ابن زیاد کے خط کا مضمون معلوم ہوا۔ تو انھوں نے کہا۔" اگر ممکن ہو تو آج انھیں ٹال دو۔ تاکہ آج رات اپنے رب کی اور نماز پڑھ لیں۔ اس سے دعا کریں۔ مغفرت مانگیں کیونکہ وہ جانتا ہے میں اس کی عبادت کا دلدادہ اس کی کتاب کا پڑھنے والا ہوں۔"

چنانچہ یہی جواب دیا گیا۔ اور فوج واپس آ گئی۔

(ابن جریر و یعقوبی)

آپ کی حسرت اور احباب کی وفاداری

فوج کی واپسی کے بعد رات کو آپ نے اپنے ساتھی جمع کئے اور خطبہ دیا۔

خدا کی حمد و ستائش کرتا ہوں۔ رنج و راحت ہر حالت میں اس کا شکر گذار ہوں۔ الٰہی۔ تیرا شکر کہ تو نے ہمارے گھر کو نبوت سے مشرف کیا۔ قرآن کا فہم عطا کیا۔ دین میں سمجھ بوجھ بخشی۔ اور ہمیں دیکھنے۔ سننے اور عبرت پکڑنے کی قوتوں سے سرفراز کیا۔ اما بعد لوگو! میں نہیں جانتا آج روئے زمین پر میرے ساتھیوں سے افضل اور بہتر لوگ موجود ہیں۔ یا میرے اہل بیت سے زیادہ ہمدرد اور غمگسار اہل بیت کسی کے ساتھ ہیں۔ اے لوگو! تم سب کو اللہ میری طرف سے جزائے خیر دے۔ میں سمجھتا ہوں کل میدان کا فیصلہ ہو جائیگا غور و فکر کے بعد میری رائے یہ ہے کہ تم سب خاموشی سے نکل جاؤ رات کا وقت ہے۔ میرے اہل بیت کا ہاتھ پکڑو۔ اور تاریکی میں ادھر ادھر چلے جاؤ۔ میں خوشی سے تمہیں رخصت کرتا ہوں۔ میری طرف سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ یہ لوگ صرف مجھے چاہتے ہیں۔ میری جان لے کر تم سے غافل ہو جائیں گے۔

یہ سن کر آپ کے اہل بیت بہت رنجیدہ اور بے چین ہو گئے حضرت عباس نے کہا۔ یہ کیوں؟ کیا اس لئے کہ ہم آپ کے بعد زندہ رہیں۔ خدا ہمیں وہ دن نہ دکھلائے۔

حضرت نے مسلم بن عقیل کے رشتہ داروں سے کہا، اے اولاد عقیل! مسلم کا قتل کافی ہے۔ تم چلے جاؤ۔ میں نے تمہیں اجازت دیدی۔

وہ کہنے لگے "لوگ کیا کہیں گے۔ یہی کہیں گے کہ ہم اپنے شیخ سردار اور شہزادوں کو چھوڑ کر بھاگ آئے۔ ہم نے ان کے ساتھ نہ کوئی تیر پھینکا۔ نہ نیزہ چلایا نہ تلوار چلائی۔ نہیں! واللہ یہ ہرگز نہ ہوگا ہم تو آپ پر جان مال، آل اولاد سب کچھ قربان کر دیں گے۔ آپ کے ساتھ ہو کر لڑیں گے۔ جو آپ پر گذرے گی۔ وہی ہم پر گذرے گی۔ آپ کے بعد خدا ہمیں زندہ نہ رکھے۔"

آپ کے ساتھی بھی کھڑے ہو گئے۔ مسلم بن عوسجہ اسدی نے کہا "ہم آپ کو چھوڑ دیں گے؟" حالانکہ اب تک آپ کا حق ادا نہیں کر سکے ہیں۔ واللہ نہیں! ہرگز نہیں۔ میں اپنا نیزہ دشمنوں کے سینہ میں توڑوں گا۔ جب تک قبضہ ہاتھ میں رہے گا۔ تلوار چلاتا رہوں گا۔ نہتا ہو جاؤں گا تو پتھر پھینکوں گا۔ یہاں تک کہ موت میرا خاتمہ کر دے۔

سعد بن عبداللہ الحنفی نے کہا۔ واللہ ہم آپ کو اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے۔ جب تک خدا جان نہ لے کہ ہم نے رسول اللہ کا حق محفوظ رکھا۔ واللہ اگر مجھے معلوم ہو کہ میں قتل ہو جاؤں گا۔ جلا دیا جاؤں گا۔ آگ میں بھونا جاؤں گا۔ پھر میری خاک ہوا میں اڑا دی جائیگی اور ایک مرتبہ نہیں ستر مرتبہ مجھ سے یہی سلوک کیا جائے گا۔ پھر بھی میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ یہاں تک کہ آپ کی حمایت میں فنا ہو جاؤں گا۔

زہیر بن القین نے کہا۔ بخدا اگر میں ہزار مرتبہ بھی مارا جاؤں

پھر اجاؤں گا۔ تو بھی آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں۔ خوشا نصیب اگر میرے قتل سے آپ کی اور آپ کے اہل بیت کے ان نونہالوں کی جانیں بچ جائیں۔ (ابن جریر کامل شرح نہج البلاغہ)

حضرت زینب کی بے چینی اور آپکا توصیہ صبر

حضرت زین العابدین سے روایت ہے کہ جس رات کی صبح میرے والد شہید ہوئے ہیں۔ میں بیٹھا تھا۔ میری پھوپی زینب میری تیمارداری کر رہی تھیں۔ اچانک میرے والد نے خیمہ میں اپنے ساتھیوں کو طلب کیا۔ اس وقت خیمہ میں ابوذر غفاریؓ کے غلام جوّی تلوار صاف کر رہے تھے۔ اور میرے والد شعر پڑھ رہے تھے۔

(اے زمانہ! تیرا برا ہو۔ تو کیسا بے وفا دوست ہے صبح وشام تیرے مقتول)

(کتنے مارے جاتے ہیں۔ زمانہ کسی کی رعایت نہیں کرتا۔ کسی سے عوض قبول نہیں کرتا)

(اور سارا معاملہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ہر زندہ موت کی راہ پر چلا جا رہا ہے۔)

تین چار مرتبہ آپ نے یہی شعر دہرائے۔ میرا دل بھر آیا۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ مگر میں نے آنسو روک لئے۔ میں سمجھ گیا کہ مصیبت ٹلنے والی نہیں۔ میری پھوپی نے یہ شعر سنے۔ وہ بے قابو

ہوگئیں۔ بے اختیار دوڑتی ہوئی آئیں۔ اور شیون و فریاد کرنے لگیں۔

حضرت امام نے یہ حالت دیکھی تو فرمایا۔ "اے بہن! یہ کیسا حال ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نفس و شیطان کی بے صبریاں ہمارے ایمان و استقامت پر غالب آجائیں"

انھوں نے روتے ہوئے کہا "کیونکر اس حالت پر صبر کیا جائے کہ آپ اپنے ہاتھوں قتل ہو رہے ہیں"

آپ نے کہا۔ "مشیت کا ایسا ہی فیصلہ ہے"

اس پر ان کی بے قراریاں اور بڑھ گئیں۔ اور شدت غم سے بے حال ہوگئیں۔

یہ حالت دیکھکر آپ نے ایک طولانی تقریر صبر و اقامت پر زبانی آپ نے کہا: "بہن خدا سے ڈر! خدا کی تعزیت سے تسلی حاصل کر۔ موت دنیا میں ہر زندگی کے لئے ہے۔ آسمان والے بھی ہمیشہ جیتے نہ رہیں گے۔ ہر چیز فنا ہونیوالی ہے۔ پھر موت کے خیال سے اس قدر رنج و بے قراری کیوں ہو۔ دیکھ ہمارے لئے۔ اور ہر مسلمان کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اسوۂ حسنہ ہے یہ نمونہ ہمیں کیا سکھلاتا ہے ___؟ ہمیں ہر حال میں صبر و ثبات اور توکل و رضا کی تعلیم دیتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم کسی حال میں بھی اس سے منحرف نہ ہوں"

(یعقوبی و ابن جریر)

پوری رات عبادت میں گزار دی پوری رات آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے نماز، استغفار، اور دعا و تضرع میں گزار دی۔ راوی کہتا ہے کہ دشمن کے سوار رات بھر ہمارے لشکر کے گرد چکر لگاتے رہے حضرت حسینؓ بلند آواز سے یہ آیت پڑھ رہے تھے۔

الا یحسبن الذین کفروا انما نملی لھم خیرا لانفسھم انما نملی لھم لیزدادوا اثما ولھم عذاب مھین۔ ماکان اللہ لیذر المومنین علی ما انتم حتی یمیز الخبیث من الطیب[1]

دشمن کے ایک سوار نے جب یہ آیت سنی۔ تو چلا کر کہنے لگا۔ "قسم رب کعبہ کی۔ ہم ہی طیب ہیں۔ اور تم سے الگ کر دیئے گئے ہیں۔"

عشرہ کی صبح جمعہ یا سنیچر کے دن دسویں محرم کو نماز فجر کے بعد عمر بن سعد اپنی فوج لے کر نکلا۔ حضرت حسینؓ نے بھی اپنے اصحاب کی صفیں قائم کیں۔ ان کے ساتھ صرف

---

[1] دشمن یہ خیال نہ کریں۔ کہ ہماری ڈھیل ان کے لئے بھلائی ہے۔ ہم صرف اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں۔ کہ ان کا جرم اور زیادہ ہو جائے۔ خدا مومنین کو اسی حالت میں چھوڑ رکھنے والا نہیں ہے۔ وہ پاک کو ناپاک سے الگ کر دے گا۔

بتیس سوار اور چالیس پیدل کل بہتر آدمی تھے۔ میمنہ پر زہیر بن القین کو مقرر کیا۔ علم اپنے بھائی عباس بن علی کے ہاتھ میں دے دیا خیموں کے پیچھے خندق کھود کر اس میں بہت سا ایندھن ڈھیر کر دیا۔ اور آگ جلادی تھی۔ تاکہ دشمن پیچھے سے حملہ آور نہ ہو سکے۔

شمر کی یاوہ گوئی

فوج سے شمر بن ذی الجوشن گھوڑا دوڑاتا ہوا نکلا۔ آپ کے لشکر کے گرد پھرا اور آگ دیکھ کر چلایا۔ " اے حسین! قیامت سے پہلے ہی تو نے آگ قبول کر لی۔"

حضرت نے جواب دیا۔ "اے چرواہے کے لڑکے! تو ہی آگ کا زیادہ مستحق ہے۔" مسلم بن عوسجہ نے عرض کیا۔ "مجھے اجازت دیجئے اسے تیر مار کر ہلاک کر ڈالوں۔ کیونکہ وہ بالکل زد پر ہے۔"

حضرت نے منع کیا۔ " نہیں! میں لڑائی میں پہل نہیں کروں گا۔"

(یعقوبی و ابن جریر)

دعا کیلئے ہاتھ اٹھا دیئے

دشمن کا رسالہ آگے بڑھتے دیکھ کر آپ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ الٰہی ہر مصیبت میں تو ہی میرا بھروسہ ہے۔ ہر سختی میں میرا تو ہی پشت و پناہ ہے۔ کتنی مصیبتیں پڑیں،

دل کمزور ہو گیا۔ تدبیر نے جواب دیدیا۔ دوست نے بے وفائی کی۔ دشمن نے خوشیاں مچائیں۔ مگر میں نے صرف تجھی سے التجا کی۔ اور تو نے ہی میری دستگیری کی! تو ہی ہر نعمت کا مالک ہے۔ تو ہی احسان والا ہے۔ آج بھی تجھی سے التجا کی جاتی ہے۔"

(شرح نہج البلاغہ)

جب دشمن قریب آ گیا۔ تو آپ

دشمن کے سامنے خطبہ

نے اونٹنی طلب کی سوار ہوئے قرآن سامنے رکھا۔ اور دشمن کی صفوں کے سامنے کھڑے ہو کر بلند آواز سے خطبہ دیا۔

"لوگو! میری بات سنو۔ جلدی نہ کرو۔ مجھے نصیحت کر لینے دو۔ اپنا عذر بیان کرنے دو۔ اپنی آمد کی وجہ کہنے دو۔ اگر میرا عذر معقول ہو۔ اور تم اسے قبول کر سکو۔ اور میرے ساتھ انصاف کرو۔ تو یہ تمہارے لئے خوش نصیبی کا باعث ہوگا۔ اور تم میری مخالفت سے باز آ جاؤ گے۔ لیکن اگر سننے کے بعد بھی تم میرا عذر قبول نہ کرو۔ اور انصاف کرنے سے انکار کر دو۔ تو پھر مجھے کسی بات سے بھی انکار نہیں۔ تم اور تمہارے ساتھی ایکا کر لو۔ مجھ پر ٹوٹ پڑو۔ مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔ میرا اعتماد ہر حال میں صرف پروردگار عالم پر ہے اور وہ نیکوکاروں کا حامی ہے۔"

آپ کی اہل بیت نے یہ کلام سنا۔ تو شدت تاثیر سے بے اختیار

ہو گئیں۔ اور خیمہ سے آہ و بکا کی صدا بلند ہوئی۔ آپ نے اپنے بھائی عباس اور فرزند علی کو بھیجا۔ تاکہ انھیں خاموش کرائیں۔ اور کہا" ابھی انھیں بہت رونا باقی ہے۔" پھر بے اختیار پکار اٹھے۔ خدا عباس کی عمر دراز کرے۔" یعنی ابن عباس کی! راوی کہتا ہے کہ یہ جملہ اس لئے آپ کی زبان سے نکل گیا۔ کہ مدینہ میں عبداللہ ابن عباس نے عورتوں کو ساتھ لے جانے سے منع کیا تھا۔ مگر آپ نے اس پر توجہ نہ کی تھی۔ اب ان کا جزع و فزع دیکھا۔ تو عبداللہ بن عباس کی بات یاد آ گئی۔ اور پھر آپ نے از سر نو تقریر شروع کی۔

"لوگو! میرا حسب نسب یاد کرو۔ سوچو کہ میں کون ہوں ۔؟ پھر اپنے گریبانوں میں منھ ڈالو۔ اور اپنے ضمیر کا محاسبہ کرو۔ خوب غور کرو کیا تمہارے لئے میرا قتل کرنا۔ اور میری حرمت کا رشتہ توڑنا روا ہے۔ کیا میں تمہارے نبی کی لڑکی کا بیٹا۔ اس کے عم زاد کا بیٹا نہیں ہوں کیا سید الشہداء امیر حمزہؓ میرے باپ کے چچا نہ تھے؟ کیا ذوالجناحین جعفر طیار میرے چچا نہیں ہیں؟ کیا تم نے رسول اللہ کا یہ مشہور قول نہیں سنا کہ آپ میرے اور میرے بھائی کے حق میں فرماتے تھے۔ سید شباب اہل الجنۃ (جنت میں نوعمروں کے سردار) اگر میرا یہ بیان سچا ہے۔ اور ضرور سچا ہے کیونکہ واللہ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے آج تک جھوٹ نہیں بولا۔ تو بتلاؤ۔ کیا تمھیں برہنہ تلواروں سے میرا استقبال کرنا چاہیئے۔ اگر تم میری بات پر یقین نہیں کرتے

تم میں ایسے لوگ موجود ہیں۔ جن سے تصدیق کر سکتے ہو۔ جابر بن
اللہ انصاری سے پوچھو۔ ابو سعید خدری سے پوچھو۔ سہیل بن سعد
عدیؓ سے پوچھو۔ زید بن ارقمؓ سے پوچھو۔ انس بن مالک سے پوچھو وہ
ہیں بتائیں گے۔ کہ انھوں نے میرے اور میرے بھائی کے بارے
رسول اللہ صلعم کو یہ فرماتے سنا ہے یا نہیں؟ کیا یہ بات بھی تمہیں میرا خون
بہانے سے نہیں روک سکتی۔؟ واللہ اس وقت روئے زمین پر بجز میرے
نبی کی لڑکی کا بیٹا موجود نہیں۔ میں تمہارے نبی کا بلا واسطہ نواسہ ہوں
تم اس لئے مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہو کہ میں نے کسی کی جان لی ہے
کسی کا خون بہایا ہے؟ کسی کا مال چھینا ہے؟ کہو کیا بات ہے؟ آخر
میرا قصور کیا ہے۔؟

کوفہ والوں کا جواب

آپ نے بار بار پوچھا۔ مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ آخر آپ نے بڑے بڑے کوفیوں کے نام لے لے کر پکارنا شروع کیا "اے شبث بن ربعی، اے حجاب بن الحبجر۔ اے قیس بن الاشعث، اے یزید بن الحارث! کیا تم نے مجھے نہیں لکھا تھا۔ کہ پھل پک گئے زمین سرسبز ہو گئی۔ نہریں ابل پڑیں۔ آپ اگر آئیں گے۔ تو اپنی فوج جرار کے پاس آئیں گے۔ جلد آئیے"

اس پر ان لوگوں کی زبانیں کھلیں۔ اور انھوں نے کہا "ہرگز نہیں ہم نے تو نہیں لکھا تھا۔"

آپ چلّا اٹھے۔ سبحان اللہ! یہ کیا جھوٹ ہے۔ واللہ تم نے لکھا تھا۔" اس کے بعد آپ نے پھر پکار کر کہا۔ اے لوگو! جو تم اب مجھے ناپسند کرتے ہو۔ اس لئے بہتر ہے مجھے چھوڑ دو۔ یہاں سے واپس چلا جاتا ہوں۔"

ذلت منظور نہیں

یہ سنکر قیس بن الاشعث نے کیا یہ بہتر نہیں کہ آپ اپنے آپ اپنے عزیزوں کے حوالے کر دیں۔ وہ وہی برتاؤ کریں گے۔ جو آپ کو پسند ہے۔ آپ کو ان سے کوئی گزند نہیں پہونچے گا۔"

آپ نے جواب دیا: تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے اے شخص! کیا تو چاہتا ہے کہ بنی ہاشم مجھ سے مسلم بن عقیل کے سوا ایک اور خون کا بھی مطالبہ کریں؟ نہیں! واللہ میں ذلت کے ساتھ اپنے آپ کو ان کے حوالے نہیں کر دوں گا۔"

(ابن جریر)

یہ کہکر آپ نے اونٹنی بٹھا دی۔ عقبہ بن سمعان کو حکم دیا اس کی کونچیں باندھ دے۔ اور دیکھا کہ دشمن کے لشکر نے ا... کی طرف حرکت شروع کر دی۔

زہیر کا کوفہ والوں سے خطاب

زہیر بن القین اپنا گھوڑا اڑا... لشکر کے سامنے پہونچے اور چلّا کے۔ اے اہل کوفہ! عذاب الٰہی ...

و ہر مسلمان پر اپنے بھائی کو نصیحت کرنا فرض ہے۔ دیکھو اس وقت
ب ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ ایک ہی دین اور ایک ہی طریقے پر
ئم ہیں۔ جب تک تلواریں نیام سے باہر نہیں نکلتیں۔ تم ہماری نصیحت
ر خیر خواہی کے ہر طرح حقدار ہو۔ لیکن تلوار کے درمیان آتے ہی
سی حرمت ٹوٹ جائے گی۔ اور ہم تم الگ دو گروہ ہو جائیں گے
یکھو۔ خدا نے ہمارا اور تمہارا اپنے نبی کی اولاد کے بارے میں امتحان
یا چاہا ہے۔ ہم تمہیں اہل بیت کی نصرت کی طرف بلاتے اور سرکش
بید اللہ بن زیاد کی مخالفت پر دعوت دیتے ہیں۔ یقین کرو ان
گوں سے تمہیں کبھی بھلائی حاصل نہ ہو گی۔ یہ تمہاری آنکھیں
وڑیں گے۔ تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے۔ تمہارے چہرے بگاڑیں
گے۔ تمہیں درختوں کے تنوں پر پھانسی دیں گے۔ اور نیکوکاروں کو
ن چن کر قتل کریں گے۔ بلکہ وہ تو کب کا کر چکے ہیں۔ ابھی حجر بن عدی
ہانی بن عروہ وغیرہ کے واقعات اتنے پرانے نہیں ہوئے ہیں
کہ تمہیں یاد نہ رہے ہوں گے۔

کوفیوں نے یہ تقریر سنی تو زہیر کو برا بھلا کہنے لگے۔ اور ابن
زیاد کی تعریفیں کرنے لگے "بخدا ہم اس وقت تک نہیں ٹلیں گے
جب تک حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کو قتل نہ کریں۔ یا انہیں امیر کے
روبرو حاضر نہ کریں۔" یہ ان کا جواب تھا۔

زہیر نے جواب دیا۔ "خیر اگر سمیہ کا چھوکرا (یعنی ابن زیاد)

فاطمہؑ کے بیٹے سے کہیں زیادہ حمایت و نصرت کا مستحق ہے۔ تو کم از کم اولادِ رسول کا اتنا پاس کرو کہ اسے قتل نہ کرو۔ اسے اور اس کے عم زاد یزید بن معاویہ کو چھوڑ دو۔ تاکہ آپس میں اپنا معاملہ طے کرلیں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہ یزید کو خوش کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ تم حسینؑ کا خون بہاؤ۔"

(ابن جریر و شرح نہج البلاغہ)

حر ابن یزید کی موافقت

عدی بن حرملا سے روایت ہے کہ ابن سعد نے جب فوج کو حرکت دی۔ تو حر بن یزید نے کہا " خدا آپ کو سنوارے! کیا آپ اس شخص سے واقعی لڑائی لڑیں گے۔

ابن سعد نے جواب دیا۔ ہاں واللہ لڑائی! ایسی لڑائی جس میں کم از کم یہ ہوگا۔ کہ سر کٹیں گے۔ اور ہاتھ شانوں سے اڑ جائیں گے۔ حر نے کہا " بخدا! اگر مجھے اختیار ہوتا۔ تو ضرور منظور کرلیتا۔ مگر کیا کروں تمہارا حاکم منظور نہیں کرتا۔"

حر بن یزید یہ سن کر اپنی جگہ لوٹ آیا۔ اس کے قریب خود اس کے قبیلہ کا بھی ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کا نام کرہ بن قیس تھا حر نے اس سے کہا " تم نے اپنے گھوڑے کو پانی پلا لیا۔"

بعد میں کرہ کہا کرتا تھا۔ حر کے اس سوال ہی سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ لڑائی میں شریک ہونا نہیں چاہتا۔ اور مجھے ٹالنا چاہتا ہے

تاکہ اس کی شکایت حاکم سے نہ کریں۔ یہ کہہ کر کہ میں نے گھوڑے کو پانی نہیں پلایا ہے۔ ابھی جاتا ہوں۔" میں دوسری طرف روانہ ہوگیا۔ میرے الگ ہوتے ہی حر نے امام حسینؑ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنا شروع کیا۔

اس کے قبیلہ کے ایک شخص مہاجرین اوس نے کہا کہ "کیا تم حسینؑ پر حملہ کرنا چاہتے ہو۔" حر خاموش ہوگیا۔ مہاجر کو شک ہوا کہنے لگا۔

"تمہاری خاموشی مشتبہ ہے۔ میں نے کبھی کسی جنگ میں تمہاری یہ حالت نہیں دیکھی۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کوفہ میں سب سے بہادر کون ہے؟ تو تمہارے نام کے سوا کوئی نام میری زبان پر نہیں آسکتا۔ پھر تم یہ اس وقت کیا کر رہے ہو۔؟"

حر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"بخدا میں جنت یا دوزخ کا انتخاب کر رہا ہوں۔ واللہ میں نے جنت کا انتخاب کر لیا ہے۔ چاہے مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا جائے"

یہ کہا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر لشکر حسینؑ میں پہونچ گیا۔

حضرت حسینؑ کی خدمت میں پہونچ کر کہا۔ "ابن رسول اللہ! میں ہی وہ بدبخت ہوں جس نے آپ کو ہٹنے سے روکا۔ راستہ بھر آپ کا پیچھا کیا۔ اور اس جگہ اترنے پر مجبور کیا۔ خدا کی قسم میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آئی۔ کہ یہ لوگ آپ کی شرطیں منظور نہیں کریں گے

اور آپ کے معاملہ میں اس حد تک پہونچ جائیں گے۔ واللہ! اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ وہ ایسا کریں گے۔ تو ہرگز اس حرکت کا مرتکب نہ ہوتا۔ میں اپنے قصوروں پر نادم ہو کر توبہ کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔ میں آپ کے قدموں پر قربان ہو جانا چاہتا ہوں۔ کیا آپ کے خیال میں یہ میری توبہ کے لئے کافی ہوگا۔"

حضرت نے شفقت سے فرمایا۔ ہاں! خدا تیری توبہ قبول کرے تجھے بخش دے، تیرا نام کیا ہے۔؟"

اس نے کہا "حر ابن یزید!"

فرمایا "تو حر (یعنی آزاد) ہی ہے۔ جیسا کہ تیری ماں نے تیرا نام رکھدیا ہے۔ تو دنیا میں اور آخرت میں انشاء اللہ حر ہے۔"

کوفیوں سے حر کا خطاب

پھر دشمن کی صفوں کے سامنے پہنچا اور کہا۔ اے لوگو! حسین کی پیش کی ہوئی شرطوں میں سے کوئی شرط کیوں منظور نہیں کر لیتے تاکہ خدا تمہیں اس امتحان سے بچائے۔"

لوگوں نے جواب دیا "یہ ہمارے سردار عمر بن سعد موجود ہیں جواب دیں گے۔"

عمر نے کہا۔ "میری دلی خواہش تھی کہ ان کی شرطیں منظور کر سکتا۔"

اس کے بعد حر نے نہایت جوش و خروش سے تقریر کی

اور اہل کوفہ کو ان کی بدعہدی و عذر پر شرم و غیرت دلائی لیکن
اس کے جواب میں انھوں نے تیر برسانا شروع کر دیئے۔ ناچار
خیمہ کی طرف لوٹ آیا۔

جنگ کا آغاز

اس واقعہ کے بعد عمر بن سعد نے اپنی کمان اٹھا لشکر حسینؓ کی طرف یہ کہہ کر تیر پھینکا۔
"گواہ رہو۔ سب سے پہلا تیر میں نے چلایا ہے۔" پھر تیر بازی شروع
ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد زیاد بن ابیہ اور عبید اللہ بن زیاد کے غلام
یسار اور سالم میدان میں نکلے۔ اور مبارزت طلب کی۔ قدیم
طریق جنگ میں مبارزت کا طریقہ یہ تھا۔ کہ فریقین کے لشکر سے ایک
ایک جنگ آزما نکلتا۔ اور پھر دونوں باہم گیر پیکار کرتے۔ لشکر حسینؓ
سے حبیب بن مظاہر اور بریر بن حضیر نکلنے لگے۔ مگر حضرت حسین نے
انھیں منع کیا۔ عبد اللہ بن عمیر الکلبی نے کھڑے ہو کر عرض کیا۔ مجھے
اجازت دیجئے۔ یہ شخص اپنی بیوی کے ساتھ حضرت کی حمایت کے
لئے کوفہ سے چل کر آیا تھا۔ سیاہ رنگ، تن و مند۔ کشادہ سینہ تھا۔
آپ نے اسکی صورت دیکھ کر فرمایا۔ "بیشک یہ مرد میدان ہے" اور اجازت
دی۔ عبد اللہ نے چند پھیروں میں دونوں کو زیر کر کے قتل کر ڈالا۔ اس
کی بیوی ام وہب ہاتھ میں لاٹھی لئے کھڑی تھی۔ اور جنگ کی ترغیب
دیتی تھی۔ پھر یکایک اسے اس قدر جوش آیا کہ میدان جنگ
کی طرف بڑھنے لگی۔ حضرت حسینؓ یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوئے

فرمایا "اہل بیت کی طرف سے خدا انہیں جزائے خیر دے لیکن عورتوں کے ذمہ لڑائی نہیں۔"

گھٹنے ٹیک کر نیزے سیدھے کر دیئے اس کے بعد ابن سعد کے میمنہ نے حملہ کیا۔ جب بالکل قریب پہونچ گئے۔ تو حضرت کے رفقا زمین پر گھٹنے ٹیک کر کھڑے ہوئے اور نیزے سیدھے کر دیئے۔ نیزوں کے منہ پر گھوڑے بڑھ نہ سکے۔ اور لوٹنے لگے۔ حضرت کی فوج نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اور تیر مار کر کئی آدمی قتل اور زخمی کر دیئے۔

عام حملہ اب باقاعدہ جنگ جاری ہو گئی۔ طرفین سے ایک ایک دو دو جوان نکلتے تھے اور تلوار کے جوہر دکھاتے تھے۔ حضرت حسین کے طرفداروں کا پلہ بھاری تھا۔ جو سامنے آتا تھا۔ مارا جاتا تھا۔ میمنہ کے سپہ سالار عمرو بن الحجاج نے یہ حالت دیکھی۔ تو پکار اٹھا۔ "بیوقوفو! پہلے یہ جان لو کہ کن سے لڑ رہے ہو۔ یہ لوگ جان پر کھیلے ہوئے ہیں۔ تم اسی طرح ایک ایک کر کے قتل ہوتے جاؤ گے۔ ایسا نہ کرو یہ مٹھی بھر ہیں۔ انھیں پتھروں سے مارو" عمر بن سعد نے یہ رائے پسند کی اور حکم دیا۔ کہ مبارزت موقوف کی جائے۔ اور عام حملہ شروع ہو چنانچہ میمنہ آگے بڑھا۔ اور کشت و خون شروع ہو گیا۔ ایک گھڑی بعد لڑائی رکی تو نظر آیا کہ حسینی فوج کے نامور بہادر مسلم عوسجہ خاک و خون میں پڑے ہیں

حضرت حسینؑ دوڑ کر لاش پر پہونچے۔ ابھی سانس باقی تھی۔ آہ بھر کر فرمایا: مسلم تجھ پر خدا کی رحمت۔ منھم من قضی النحبہ ومنھم ینتظر وما بدلوا تبدیلا۔ مسلم بن عوسجہ اس جنگ میں آپ کی جانب سے پہلے شہید تھے۔

(ابن جریر و کامل)

گھوڑے بیکار ہو گئے

میمنہ کے بعد میسرہ نے یورش کی۔ شمر بن ذی الجوشن اس کا سپہ سالار تھا۔ حملہ بہت سخت تھا۔ مگر حسینی میسرے نے بڑی ہی بہادری سے مقابلہ کیا۔ اس بازو میں صرف ۳۲ سوار تھے۔ جس طرف ٹوٹ پڑتے تھے۔ صفیں الٹ جاتی تھیں۔ آخر طاقتور دشمن نے محسوس کر لیا کہ کامیابی ناممکن ہے۔ چنانچہ فوراً ہی کمک طلب کی۔ بہت سے سپاہی اور پانسو تیرانداز مدد کو پہونچ گئے۔ انھوں نے آتے ہی تیر برسانا شروع کر دیئے۔ تھوڑی دیر میں حسینی فوج کے تمام گھوڑے بیکار ہو گئے اور سواروں کو پیدل جانا پڑا۔

حر کی شجاعت

ابو سعید بن مشرح روایت کرتا ہے کہ حر بن یزید کا گھوڑا خود میں نے زخمی کیا تھا۔ میں نے اسے تیروں سے چھلنی کر ڈالا۔ حر بن یزید زمین پر کود پڑے۔ تلوار ہاتھ میں لئے بالکل شیر ببر معلوم ہوتے تھے۔ تلوار ہر طرف متحرک تھی۔ اور یہ شعر زبان پر تھا۔

(اگر تم نے میرا گھوڑا بیکار کر دیا۔ تو کیا ہوا۔؟
میں شیر علیؑ کا بیٹا ہوں۔ خوفناک شیر سے بھی
زیادہ بہادر ہوں۔)

خیمے جلا دیئے

لڑائی اپنی پوری ہولناکی سے جاری تھی۔ اب دوپہر ہو گئی۔ مگر کوئی فوج غلبہ حاصل نہ کر سکی وجہ یہ تھی کہ حسینی فوج نے تمام خیمے ایک جگہ جمع کر دیئے تھے۔ اور دشمن صرف ایک ہی رخ سے حملہ کر سکتا تھا۔ عمر بن سعد نے یہ دیکھا تو خیمے اکھاڑ ڈالنے کے لئے آدمی بھیجے۔ حسینی فوج کے صرف چار پانچ آدمی یہاں مقابلہ کے لئے کافی ثابت ہوئے۔ خیموں کی آڑ سے دشمن کے آدمی قتل کرنے لگے۔ جب یہ صورت بھی ناکامیاب رہی۔ تو عمر بن سعد نے خیمے جلا ڈالنے کا حکم دیا۔ سپاہی آگ لے کر دوڑے۔ حسینی فوج نے یہ دیکھا۔ تو مضطرب ہوئی۔ مگر حضرت حسینؑ نے فرمایا" کچھ پرواہ نہیں۔ جلانے دو۔ یہ ہمارے لئے اور بھی زیادہ بہتر ہے۔ اب وہ پیچھے سے حملہ نہیں کر سکیں گے اور ہوا بھی یہی۔

ام وہب کا قتل

اسی اثناء میں زہیر بن القین نے شمر پر زبردست حملہ کیا۔ اور اس کی فوج کے قدم اکھاڑ دیئے۔ مگر کب تک؟ ذرا دیر کے بعد پھر دشمن کا ہجوم ہو گیا اب حسینی لشکر کی بے بسی صاف ظاہر تھی۔ بہت سے لوگ قتل

ہو چکے تھے۔ کئی نامی سردار مارے جا چکے تھے۔ جتنے کہ بن عمیر کلبی بھی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ قتل ہو چکا تھا۔ اس کی بیوی ام وہب بھی شہید ہو چکی تھی۔ یہ میدان جنگ میں بیٹھی اپنے مقتول شوہر کے چہرے سے مٹی صاف کر رہی تھی۔ اور یہ کہتی جاتی تھی۔ "تجھے جنت مبارک ہو۔"

شمر نے اسے دیکھا۔ اور قتل کر ڈالا۔

(ابن جریر، شرح نہج البلاغہ)

نماز پڑھنے نہیں دی

ابو ثمامہ عمرو بن عبداللہ صائدی نے اپنی بے بسی کی حالت محسوس کی اور جناب حسینؑ سے عرض کیا "دشمن اب بالکل قریب آ گیا ہے۔ واللہ آپ اس وقت تک قتل ہونے نہیں پائیں گے۔ جب تک میں قتل نہ ہو جاؤں۔ لیکن میری آرزو ہے کہ اپنے رب سے نماز پڑھ کر ملوں۔ جس کا وقت قریب آ گیا ہے۔"

یہ سن کر حضرت نے سر اٹھایا اور فرمایا۔ دشمنوں سے کہو ہمیں نماز کی مہلت دیں۔ مگر دشمنوں نے درخواست منظور نہیں کی اور لڑائی جاری رہی۔

حبیب اور حر کی شہادت

یہ وقت بہت سخت تھا دشمن نے اپنی پوری طاقت لگا دی تھی۔ غضب یہ ہوا کہ حسینی میسرے کے سپہ سالار حبیب ابن مظاہر

بھی قتل ہو گئے۔ گویا فوج کی کمر ٹوٹ گئی۔ حبیب کے بعد ہی حر بن یزید کی باری تھی۔ جوش سے یہ شعر پڑھتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس پڑے۔

(میں نے قسم کھائی ہے کہ قتل نہیں ہوں گا جب تک کہ قتل نہ کر لوں۔ اور مروں گا اسی حالت میں مروں گا کہ آگے بڑھ رہا ہوں گا۔)

انھیں تلوار کی کاری ضربوں سے ماروں گا۔ نہ بھاگوں گا۔ نہ دوڑوں گا۔)

زہیر کی شہادت

چند لمحوں کی بات تھی۔ حر زخموں سے چور ہو کر گر پڑے۔ اور جاں بحق تسلیم ہو گئے۔ اب ظہر کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ حضرت نے اپنے سب ساتھیوں کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز کے بعد دشمن کا دباؤ اور بھی زیادہ ہو گیا۔ اس موقع پر آپ کے میسرے کے سپہ سالار زہیر بن القین نے میدان اپنے ہاتھ لے لیا۔ اور شعر پڑھتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑے۔

(میں زہیر ہوں۔ ابن القین ہوں۔ اپنی تلوار کی نوک سے انھیں حسینؑ سے دور کر دوں گا۔)

صفیں درہم برہم کر ڈالیں۔ پھر لوٹے۔ اور حضرت حسینؑ کے شانے پر ہاتھ مار کر جوش سے یہ شعر پڑھے

(بڑھ، خدا نے تجھے ہدایت دی۔ آج تو اپنے نانا نبی سے ملاقات کرے گا۔)

اور حسن سے علی مرتضیٰ سے۔ اور بہادر جوان جعفر طیّار سے (اور شہید زندہ اسد اللہ حمزہ سے)

پھر دشمن کی طرف لوٹے اور قتل کرتے رہے، یہاں تک کہ قتل ہو گئے۔

غفاری بھائیوں کی بہادری اب آپ کے ساتھیوں نے دیکھا کہ دشمن کو روکنا ناممکن ہے۔ چنانچہ انہوں نے طے کیا کہ آپ کے سامنے ایک ایک کر کے قتل ہو جائیں۔ چنانچہ دو غفاری بھائی آگے بڑھے۔ اور لڑنے لگے یہ شعر ان کی زبان پر تھے۔

(بنی غفار اور قبائل نزار نے اچھی طرح جان لیا ہے؟ (کہ ہم بے پناہ شمشیر آب دار سے فاجروں کے ٹکڑے اڑا دیں گے)

(اے قوم! تلواروں اور نیزوں سے شریفوں کی حمایت کرو)

جابری لڑکوں کی فداکاری ان کے دو جابری لڑکے سامنے آئے۔ دونوں بھائی تھے اور زار و قطار رو رہے تھے حضرت نے انھیں دیکھا تو فرمایا

لگے۔ اے میرے بھائی کے فرزند! کیوں روتے ہو۔ مجھے یقین ہے ابھی چند لمحے بعد تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔"

انہوں نے گریہ سے ٹوٹی ہوئی آواز میں عرض کیا۔ ہم اپنی جان پر نہیں روتے۔ ہم آپ پر روتے ہیں۔ دشمن نے آپ کو گھیر لیا ہے اور ہم آپ کے کچھ بھی کام نہیں آسکتے۔" پھر دونوں نے بڑی ہی شجاعت سے لڑنا شروع کیا۔ بار بار چلاتے تھے۔ السلام علیک یا ابن رسول اللہ!"

آپ جواب دیتے تھے۔" وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ" اور وہ دشمن پر ٹوٹ پڑتے تھے آخر دونوں شہید ہو گئے۔

حنظلہ بن اسعد کی شہادت

ان کے بعد حنظلہ بن اسعد حضرت کے سامنے آکر کھڑے ہوئے۔ اور بلند آواز میں دشمن سے مخاطب ہوئے" اے قوم میں ڈرتا ہوں عاد و ثمود کی طرح تمہیں بھی روز بد نہ دیکھنا پڑے۔ میں ڈرتا ہوں کہ تم برباد نہ ہو جاؤ۔ اے قوم حسینؑ کو قتل نہ کرو۔ ایسا نہ ہو خدا تم پر عذاب نازل نہ کر دے۔" بالآخر یہ بھی شہید ہو گئے

علی اکبر کی شہادت

غرض کہ یکے بعد دیگرے تمام اصحاب قتل ہو گئے۔ اب بنی ہاشم اور خاندان نبوت کی باری تھی۔ سب سے پہلے آپ کے صاحبزادے علی اکبر میدان میں آئے۔ اور دشمن پر حملہ کیا۔ ان کا رجز یہ تھا۔

(میں علی بن حسین بن علی ہوں۔ قسم رب کعبہ کی ہم نبی کے قرب کے زیادہ حقدار ہیں)
(قسم خدا کی، نامعلوم باپ کے لڑکے کا بیٹا ہم پر حکومت نہیں کر سکے گا)

بڑی شجاعت سے لڑے آخر مرہ بن منقذ العبدی کی تلوار سے شہید ہو گئے۔ ایک راوی کہتا ہے کہ میں نے دیکھا خیمہ سے ایک عورت تیزی سے نکلی۔ اتنی حسین تھی جیسے اٹھتا ہوا سورج! وہ چلا رہی تھی "آہ! بھائی! آہ بھتیجے"! میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا "زینب بنت فاطمہ بنت رسول اللہ صلعم" لیکن حضرت حسین نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور خیمہ میں پہنچا آئے۔ پھر علی کی نعش اٹھائی اور خیمے کے سامنے لا کر رکھ دی۔

(ابن جریر شرح نہج البلاغہ)

ایک جوان رعنا

ان کے بعد اہل بیت اور بنی ہاشم کے دوسرے جانفروش قتل ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ میدان میں ایک جوان رعنا نمودار ہوا۔ وہ کرتا پہنے، تہہ بند باندھے۔ پاؤں میں نعل پہنے تھا۔ بائیں نعل کی ڈوری ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ اس قدر حسین تھا کہ اس کا چہرہ چاند کا ٹکڑا معلوم ہوتا تھا۔ شیر کی طرح جھپٹتا ہوا آیا اور دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ عمرو بن سعد الازدی نے اس کے سر پر تلوار ماری۔ نوجوان چلایا "ہائے چچا"! اور منہ کے بل گر پڑا۔ آواز

سنتے ہی حضرت حسینؓ بھوکے باز کی طرح ٹوٹے۔ اور غضبناک شیر کی طرح قاتل پر لپکے۔ بے پناہ تلوار کا وار کیا۔ قاتل نے ہاتھ اٹھا دیا مگر ہاتھ کہنی سے کٹ کر اڑ چکا تھا۔ زخم کھا کر قاتل نے پکارنا شروع کیا۔ فوج اسے بچانے کے لئے ٹوٹ پڑی۔ مگر گھبراہٹ میں بچانے کے بجائے اسے روند ڈالا۔

راوی کہتا ہے "جب غبار چھٹ گیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ حضرت حسینؓ لڑکے کے سرہانے کھڑے ہیں۔ وہ ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ اور آپ فرماتے ہیں" ان کے لئے ہلاکت۔ جنھوں نے تجھے قتل کیا ہے قیامت کے دن تیرے نانا کو جواب دیں گے۔ بخدا تیرے چچا کے لئے یہ سخت غیرت کا مقام ہے کہ تو اسے پکارے اور وہ جواب نہ دے۔ یا جواب دے۔ مگر اس کی آواز تجھے نفع نہ پہنچا سکے" افسوس تیرے چچا کے دشمن بہت ہو گئے۔ اور دوست باقی نہ رہے۔ پھر لاش اپنی گود میں اٹھالی۔ لڑکے کا سینہ آپ کے سینہ سے ملا ہوا تھا۔ اور پاؤں زمین پر رگڑتے جاتے تھے۔ اس حال سے آپ اسے لائے۔ اور علی اکبر کی لاش کے پہلو میں لٹا دیا۔ راوی کہتا ہے۔ "میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا" قاسم بن حسنؓ بن علیؓ بن ابی طالب"

مولود تازہ کی شہادت

حضرت حسینؓ پھر اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔ لیکن اس وقت آپ کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ وہ آپ کے پاس لایا گیا۔ آپ نے اسے گود میں رکھا

اور اس کے کان میں اذان دینے لگے۔ اچانک ایک تیر آیا۔ اور بچہ کے حلق میں پیوست ہو گیا۔ بچہ کی روح اسی وقت پرواز کر گئی آپ نے تیر اس کے حلق سے کھینچ لیا۔ خون سے چلو بھرا اور اس کے جسم پر ملتے اور فرمانے لگے۔ واللہ تو خدا کی نظر میں حضرت صالح کی اونٹنی سے زیادہ عزیز ہے۔ اور محمدؐ خدا کی نظر میں صالح سے زیادہ افضل ہیں۔ الٰہی! اگر تو نے ہم سے اپنی نصرت روک لی ہے جس میں تیری بہتری ہے۔" (دایوبی وابن جریر وغیرہ)

بنی ہاشم کے مقتول

اسی طرح ایک ایک کرکے اکثر بنی ہاشم اور اہل بیت شہید ہو گئے۔ ان میں سے ذیل کے نام مورخین نے محفوظ رکھے ہیں۔ (۱) محمد بن ابی سعید بن عقیل (۲) عبداللہ بن مسلم بن عقیل (۳) عبداللہ بن عقیل (۴) عبدالرحمن بن عقیل (۵) جعفر بن عقیل (۶) محمد بن عبداللہ بن جعفر (۷) عون بن عبداللہ بن جعفر (۸) عباس بن علی (۹) عبداللہ بن علی (۱۰) عثمان بن علی (۱۱) محمد بن علی (۱۲) ابوبکر بن علی (۱۳) ابوبکر بن الحسن (۱۴) عبداللہ بن الحسن (۱۵) قاسم بن الحسن۔ (۱۶) علی بن الحسین (۱۷) عبداللہ بن الحسین۔

ایک بچے کی شہادت

اس کے بعد خود آپ کی باری تھی۔ آپ میدان میں تنہا کھڑے تھے۔ دشمن یلغار کرتے آتے تھے۔ مگر وار کرنے کی ہمت نہ

پڑتی تھی۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ اس قتل کا گناہ دوسرے کے
سر ڈالے۔ لیکن شمر بن ذالجوشن نے لوگوں کو برانگیختہ کرنا شروع کیا
ہر طرف سے آپ کو گھیر لیا گیا۔ اہل بیت کے خیمے میں چند کم عمر لڑکے
اور عورتیں رہ گئی تھیں۔ اندر سے ایک لڑکے نے آپ کو اس طرح
گھرا دیکھا۔ تو جوش سے بیخود ہو گیا۔ اور خیمہ کی لکڑی لے کر دوڑ پڑا
راوی کہتا ہے کہ اس کے کانوں پر دُر پڑے ہل رہے تھے۔ یہ گھبرایا
ہوا دائیں بائیں دیکھتا چلا۔ حضرت زینب کی نظر پڑ گئی دوڑ کر پکڑ لیا
حضرت حسین نے بھی دیکھ لیا۔ اور بہن سے کہا "روکے رہو آنے نہ پائے
مگر لڑکے نے زور کر کے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ اور حضرت کے پہلو میں
پہونچ گیا۔ عین اسی وقت بحر بن کعب نے آپ پر تلوار اٹھائی۔ لڑکے
نے فوراً ڈانٹ بتائی "او خبیث! میرے چچا کو قتل کرے گا"
سنگدل حملہ آور نے اپنی بلند تلوار لڑکے پر چھوڑ دی۔ اس نے ہاتھ پر روکی
ہاتھ کٹ گیا۔ ذرا سی کھال لگی رہ گئی۔ بچہ تکلیف سے چلایا۔ حضرت نے
اسے سینہ سے چمٹا لیا۔ اور فرمایا "صبر کر اسے ثواب خداوندی کا ذریعہ
بنا۔ اللہ تعالیٰ تجھے بھی تیرے صالح بزرگوں تک پہنچا دے گا۔ رسول اللہ
صلعم، علی ابن ابی طالب، حمزہؓ، جعفر اور حسن بن علی تک۔

حضرت حسینؑ کی شجاعت

اب آپ پر ہر طرف سے نرغہ شروع ہوا۔ آپ نے بھی تلوار
چلانا شروع کی۔ پیدل فوج پر ٹوٹ پڑے اور تن تنہا اس کے قدم اکھاڑ

دیئے۔ عبداللہ بن عمار، جو خود اس جنگ میں شریک تھا۔ روایت کرتا ہے کہ میں نے نیزے سے حضرت حسین پر حملہ کیا۔ اور ان کے بالکل قریب پہونچ گیا۔ اگر میں چاہتا تو قتل کر سکتا تھا۔ مگر یہ خیال کر کے ہٹ گیا کہ یہ گناہ اپنے سر کیوں لوں۔ میں نے دیکھا۔ دائیں بائیں ہر طرف سے ان پر حملے ہو رہے تھے۔ لیکن وہ جس طرف مڑ جاتے تھے۔ دشمن کو بھگا دیتے تھے۔ وہ اس وقت کرتہ پہنے اور عمامہ باندھے تھے۔ واللہ میں نے کبھی کسی شکستہ دل کو جس کا گھر کا گھر خود اس کی آنکھوں کے سامنے قتل ہو گیا ہو۔ ایسا شجاع، ثابت قدم مطمئن اور جری نہیں دیکھا۔ حالت یہ تھی کہ دائیں بائیں سے دشمن اس طرح بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ جس طرح شیر کو دیکھ کر بکریاں بھاگ جاتی ہیں۔ دیر تک یہی حالت رہی۔ اسی اثنا میں آپ کی بہن زینب بنت فاطمہ (علیہا السلام) خیمے سے باہر نکلیں۔ ان کے کانوں میں بالیاں پڑی تھیں۔ وہ چلا تی تھیں۔ "کاش آسمان زمین پر ٹوٹ پڑے۔" یہ وہ موقع تھا۔ جبکہ عمر بن سعد حضرت حسینؓ سے بالکل قریب ہو گیا تھا۔ حضرت زینب نے پکار کر کہا "اے عمر! کیا ابو عبداللہ تمہاری آنکھوں کے سامنے قتل ہو جائیں گے" عمر نے منہ پھیر لیا۔ مگر اس کے رخسار اور ڈاڑھی پر آنسوؤں کی لڑیاں بہنے لگیں۔

لڑائی کے دوران

آپ کے حلق میں تیر پیوست ہو گیا۔ آپ کو سخت پیاس

اب نے دلق میں تیر

لگی۔ آپ پانی پینے فرات کی طرف چلے۔ مگر دشمن کب جانے دیتا تھا۔ اچانک ایک تیر آیا۔ اور آپ کے حلق میں پیوست ہو گیا۔ آپ نے تیر کھینچ لیا۔ پھر آپ نے ہاتھ منہ کی طرف اٹھائے۔ تو دونوں خون سے بھر گئے۔ آپ نے خون آسمان کی طرف اچھالا۔ اور خدا کا شکر ادا کیا "الٰہی میرا شکوہ تجھی سے ہے۔ دیکھ تیرے رسول کے نواسے سے کیا برتاؤ ہو رہا ہے۔"

تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

شمر کو سرزنش پھر آپ اپنے خیمے کی طرف لوٹنے لگے۔ تو شمر اور اس کے ساتھیوں نے یہاں بھی تعرض کیا۔ حضرت نے محسوس کیا کہ ان کی نیت خراب ہے۔ خیمہ لوٹنا چاہتے ہیں۔ فرمایا "اگر تم میں دین نہیں۔ اور تم روز آخرت سے ڈرتے نہیں۔ تو کم از کم دنیا دی شرافت پر قائم رہو۔ میرے خیمہ کو اپنے جاہلوں اور اوباشوں سے محفوظ رکھو۔"

شمر نے جواب دیا " اچھا ایسا ہی کیا جائے گا۔ اور آپ کا خیمہ محفوظ رہے گا۔"

آخری تنبیہ اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ راوی کہتا ہے کہ دشمن اگر چاہتا۔ تو آپ کو بہت پہلے قتل کر ڈالتا۔ مگر گناہ کوئی بھی اپنے سر لینے کو تیار نہ تھا۔ آخر شمر بن ذی الجوشن چلایا " تمہارا برا ہو کیا انتظار کرتے ہو۔ کیوں کام تمام نہیں کرتے۔"؟

اب پھر ہر طرف سے نرغہ ہوا۔ آپ نے پکار کر کہا "کیوں میرے قتل پر ایک دوسرے کو ابھارتے ہو؟ واللہ میرے بعد کسی بندے کے قتل پر بھی خدا اتنا ناخوش نہ ہوگا۔ جتنا میرے قتل پر ناخوش ہوگا۔"

شہادت

مگر اب وقت آ چکا تھا۔ زرعہ بن شریک تمیمی نے آپ کے بائیں ہاتھ کو زخمی کیا۔ پھر شانے پر تلوار ماری۔ آپ کمزوری سے لڑکھڑا گئے۔ لوگ ہیبت سے پیچھے ہٹے۔ مگر سنان بن انس نخعی نے بڑھ کر نیزہ مارا۔ اور آپ زمین پر گر پڑے۔ اس نے ایک شخص سے کہا "سر کاٹ لے" وہ سر کاٹنے کے لئے لپکا۔ مگر جرأت نہ ہوئی۔ سنان بن انس نے دانت پیس کر کہا۔ خدا تیرے ہاتھ شل کر ڈالے! پھر خود گھوڑے سے اترا۔ آپ کو ذبح کیا۔ اور سر تن سے جدا کر دیا۔

جعفر بن محمد علی سے مروی ہے کہ قتل کے بعد دیکھا گیا کہ آپ کے جسم پر نیزے کے ۳۳ زخم اور تلوار کے ۳۴ گھاؤ تھے۔

قاتل

سنان بن انس قاتل کے دماغ میں کسی قدر فتور تھا قتل کے وقت اس کی عجیب حالت تھی۔ جو شخص بھی حضرت کی نعش کے قریب آتا تھا۔ وہ اس پر حملہ آور ہوتا تھا وہ ڈرتا تھا کہ کوئی دوسرا ان کا سر نہ کاٹ لے جائے۔ قاتل نے سر کاٹ کر خولی بن یزید اصبحی کے حوالے کیا۔ اور خود عمر بن سعد کے پاس دوڑ گیا۔ اور خیمے کے سامنے کھڑا ہو کر چلایا۔

(مجھے سونے چاندی سے لاد دو۔ میں نے بڑا بادشاہ مارا ہے)

(میں نے اس کو قتل کیا ہے۔ جس کے ماں باپ سب سے افضل ہیں۔ اور جو اپنے نسب میں سب سے اچھا ہے)

عمر بن سعد نے اسے اندر بلا لیا۔ اور بہت خفا ہو کر کہنے لگا واللہ تو مجنوں ہے۔" پھر اپنی لکڑی سے اسے مار کر کہا۔" پاگل ایسی بات کہتا ہے۔ بخدا اگر عبید اللہ بن زیاد سنتا۔ تو تجھے ابھی مروا ڈالتا۔"

(ابن جریر)

لوٹ کھسوٹ قتل کے بعد کوفیوں نے آپ کے بدن کے کپڑے تک اتار لئے۔ پھر آپ کے خیمے کی طرف بڑھے۔ زین العابدین بستر پر بیمار پڑے تھے۔ شمر اپنے چند سپاہیوں کے ساتھ پہنچا اور کہنے لگا" اسے بھی کیوں نہ قتل کر ڈالیں" لیکن اس کے بعد ساتھیوں نے مخالفت کی اور کہا۔" کیا بچوں کو بھی مار ڈالو گے۔؟"

اسی اثناء میں عمر بن سعد بھی آ گیا۔ اور حکم دیا۔ کوئی عورتوں کے خیمے میں نہ گھسے۔ اس بیمار کو کوئی نہ چھیڑے۔ جس کسی نے خیمہ کا اسباب لوٹا ہو واپس کر دے۔"

زین العابدین نے یہ سنکر اپنی بیمار آواز سے کہا۔ عمر بن سعد خدا تجھے جزائے خیر دے۔ تیری زبان نے ہمیں بچا لیا۔

نعش روند ڈالی

عمر بن سعد کو حکم تھا کہ حسینؑ کی نعش گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالے۔ اب اس کا وقت آیا۔ اس نے پکار کر کہا: "اس کام کے لئے کون تیار ہے" دس آدمی تیار ہوئے۔ اور گھوڑے دوڑا کر جسم مبارک روند ڈالا۔

چوں بگزرد نظیری خونیں کفن بہ حشر
خلقے فغاں کنند کہ ایں دادخواہ کیست

اس جنگ میں حضرت حسینؑ کے ۷۲ آدمی مارے گئے۔ اور کوفی فوج کے ۸۸ مقتول ہوئے۔ (ابن جریر۔ کامل۔ یعقوبی)

حضرت زینب نے پامال لاش دیکھی

دوسرے دن عمر بن سعد نے میدان جنگ سے کوچ کیا۔ اہل بیت کے خاتونوں اور بچوں کو ساتھ لے کر کوفہ روانہ ہو گیا۔

قرہ بن قیس (جو شاہد عینی ہے) روایت کرتا ہے کہ ان عورتوں نے جب حضرت حسینؑ اور ان کے لڑکوں کی و عزیزوں کی پامال لاشیں پڑی دیکھیں۔ تو ضبط نہ کر سکیں۔ اور آہ و فریاد کی صدائیں بلند ہو گئیں۔ میں گھوڑا لے کر ان کے قریب پہنچا۔ میں نے کبھی اتنی حسین عورتیں نہیں دیکھی تھیں۔ جیسے زینب بنت فاطمہ (علیہا السلام) کا یہ بین کسی طرح بھی نہیں بھولتا: "اے محمدؐ تجھ پر آسمان کے فرشتوں کا درود و سلام یہ دیکھ حسینؑ ریگستان میں پڑا ہے۔ خاک و خون سے آلودہ ہے

تمام بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ تیری بیٹیاں قیدی ہیں۔ تیری اولاد مقتول ہے۔ ہوا ان پر خاک ڈال رہی ہے۔ راوی کہتا ہے۔ دوست و دشمن کوئی نہ تھا۔ جو ان کے بین سے رونے نہ لگا ہو۔

(ابن جریر)

۷۲ سر

پھر تمام مقتولوں کے سر کاٹے گئے۔ کل ۷۲ سر تھے شمر بن ذی الجوشن۔ قیس بن الاشعث۔ عمرو بن الحجاج عزرہ بن قیس۔ یہ تمام سر عبیداللہ بن زیاد کے پاس گئے۔

حضرت کا سر ابن زیاد کے سامنے

حمید بن مسلم (جو خولی بن یزید کے ساتھ حضرت حسینؓ کا سر کوفہ میں لایا تھا) روایت کرتا ہے کہ حسینؓ کا سر ابن زیاد کے سامنے رکھا گیا۔ مجلس حاضرین سے لبریز تھی۔ ابن زیاد کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ چھڑی آپ کے لبوں پر مارنے لگا۔

جب اس نے بار بار یہی حرکت کی۔ تو زید بن ارقم صحابی چلا اُٹھے" ان لبوں سے اپنی چھڑی ہٹا لیے۔ قسم خدا کی میری ان دونوں آنکھوں نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ اپنے ہونٹ ان ہونٹوں پر رکھتے تھے۔ اور ان کا بوسہ لیتے تھے" یہ کہکر وہ زار و قطار رونے لگے۔

ابن زیاد خفا ہو گیا" خدا تیری آنکھوں کو رلائے۔ واللہ اگر تو بوڑھا ہو کر سٹھیا گیا نہ ہوتا۔ تو ابھی تیری گردن مار دیتا۔"

زید بن ارقم یہ کہتے ہوئے مجلس سے چلے گئے" اے عبید کے

لوگو! آج کے بعد سے تم غلام ہو۔ تم نے ابن فاطمہ کو قتل کیا۔ ابن مرجانہ (یعنی عبید اللہ) کو حاکم بنایا۔ وہ تمہارے نیک انسان قتل کرتا اور شریروں کو غلام بناتا ہے۔ تم نے ذلت پسند کرلی۔ خدا انہیں مارے جو ذلت قبول کرتے ہیں۔

بعض روایات میں یہ واقعہ خود یزید کی طرف منسوب ہے۔ مگر صحیح یہی ہے کہ ابن زیاد نے چھڑی ماری تھی۔

ابن زیاد اور حضرت زینب

راوی کہتا ہے کہ جب اہل بیت کی خاتونیں اور بچے عبید اللہ کے سامنے پہنچے۔ تو حضرت زینب نے جو نہایت حقیر لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ پہچانی نہیں جاتی تھیں۔ ان کی کنیزیں انھیں اپنے بیچ میں لئے تھیں۔ عبید اللہ نے پوچھا "یہ کون بیٹھی ہے؟" انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تین مرتبہ یہی سوال کیا۔ مگر وہ خاموش رہیں۔ ان کی ایک کنیز نے کہا۔ "یہ زینب بنت فاطمہ ہیں۔" عبید اللہ شماتت کی راہ سے چلایا۔ "اس خدا کی ستائش جس نے تم لوگوں کو رسوا اور ہلاک کیا ہے۔ اور تمہارے نام کو بٹہ لگایا۔"

اس پر حضرت زینب نے جواب دیا "ہزار ستائش اس خدا کے لئے جس نے ہمیں محمدؐ سے عزت بخشی۔ اور ہمیں پاک کیا۔ نہ کہ جیسا تو کہتا ہے۔ فاسق رسوا ہوتے فاجروں کے نام کو بٹہ لگتا ہے۔

ابن زیاد نے کہا۔ "تو نے دیکھا۔ خدا نے تیرے خاندان سے

کیا سلوک کیا؟"

حضرت زینب بولیں "ان کی قسمت میں قتل کی موت لکھی تھی اس لئے وہ مقتل میں پہونچ گئے۔ عنقریب خدا انھیں اور تجھے ایک جگہ جمع کر دیگا۔ اور تم باہم اس کے حضور سوال و جواب کر لو گے!"

ابن زیاد غضبناک ہوا۔ اس کا غصہ دیکھکر عمرو بن حریث نے کہا "خدا امیر کو سنوارے۔ یہ تو محض ایک عورت ہے۔ عورتوں کی بات کا خیال نہ کرنا چاہیئے۔"

پھر کچھ دیر بعد ابن زیاد نے کہا "خدا نے تیرے سرکش سردار اور تیرے اہل بیت کے نافرمان باغیوں کی طرف سے میرا دل ٹھنڈا کر دیا۔" اس پر حضرت زینب اپنے تئیں سنبھال نہ سکیں بے اختیار رو پڑیں انھوں نے کہا "واللہ تو نے میرے سردار کو قتل کر ڈالا میرا خاندان مٹا ڈالا۔ میری شاخیں کاٹ دیں۔ میری جڑ اکھاڑ دی۔ اگر اس سے تیرا دل ٹھنڈا ہو سکتا ہے تو ہو جا سے۔"

ابن زیاد نے مسکرا کر کہا "یہ شجاعت ہے۔ تیرا باپ بھی شاعر اور شجاع تھا۔"

زینب نے کہا "عورت کو شجاعت سے کیا سروکار میری مصیبت نے مجھے شجاعت سے غافل کر دیا ہے۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں یہ تو دل کی آگ ہے۔"

ابن زیاد اور امام زین العابدین

اس گفتگو سے فارغ ہو کر ابن زیاد کی نظر زین العابدین علی بن الحسین پر پڑی۔ یہ بیمار تھے۔ ابن زیاد نے ان سے ان کا نام پوچھا۔ انھوں نے کہا "علی بن الحسین"۔ ابن زیاد نے ان سے کہا کہ "اللہ نے علی بن الحسین کو قتل نہیں کر ڈالا"

زین العابدین نے کوئی جواب نہیں دیا

ابن زیاد نے کہا "بولتا کیوں نہیں؟"

انھوں نے جواب دیا "میرے ایک اور بھائی کا نام بھی علی تھا لوگوں نے غلطی سے انھیں مار ڈالا"

ابن زیاد نے کہا "لوگوں نے نہیں خدا نے مارا ہے"

اس پر زین العابدین نے یہ آیت پڑھی (اللہ یتوفی الانفس حین موتہا و ما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ۔)

اس پر ابن زیاد چلایا "خدا تجھے مارے۔ تو بھی انھیں میں سے ہے" اس پر ابن زیاد نے چاہا انھیں بھی قتل کر ڈالے لیکن زینبؓ بیقرار ہو کر چیخ اٹھیں "میں تجھے خدا کا واسطہ دیتی ہوں کہ اگر تو مومن ہے۔ اور اس لڑکے کو ضرور ہی قتل کرنا چاہتا ہے۔ تو مجھے بھی اسی کے ساتھ مار ڈال"

امام زین العابدین نے بلند آواز سے کہا "اے ابن زیاد اگر تو

ان عورتوں سے ذرا بھی رشتہ سمجھتا ہے۔ تو میرے بعد ان کے ساتھ کسی متقی آدمی کو بھیجنا۔ جو اسلامی معاشرت کے اصول پر ان سے برتاؤ کرے۔ ابن زیاد دیر تک حضرت زینب کو دیکھتا رہا۔ پھر لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ رشتہ بھی کیسی عجیب چیز ہے۔ واللہ مجھے یقین ہے کہ سچے دل سے لڑکے کے ساتھ قتل ہونا چاہتی ہے۔ اچھا لڑکے کو چھوڑ دو یہ بھی اپنے خاندان کی عورتوں کے ساتھ جائے۔

(ابن جریر، کامل)

ابن عفیف کا قتل

اس واقعہ کے بعد ابن زیاد نے جامع مسجد میں شہر والوں کو جمع کیا۔ اور خطبہ دیتے ہوئے اس خدا کی تعریف کی۔ جس نے حق کو ظاہر کیا۔ حق والوں کو فتحیاب کیا۔ امیرالمومنین یزید بن معاویہ اور ان کی جماعت غالب ہوئی کذاب ابن کذاب حسین بن علی اور ان کے ساتھیوں کو ہلاک کر ڈالا۔ یہ سنکر عبداللہ بن عفیف ازدی (جو حضرت علی کے مشہور صحابی ہیں۔ اور جنگ جمل و صفین میں زخمی ہو کر اپنی دونوں آنکھیں کھو چکے تھے) کھڑے ہو گئے۔ اور چلائے خدا کی قسم اسے ابن مرجانہ۔ کذاب ابن کذاب تو ہے۔ نہ کہ حسین بن علی۔ ابن زیاد نے یہ سنکر انھیں قتل کر ڈالا۔

یزید کے سامنے

اس کے بعد ابن زیاد نے حضرت حسین کا سر بانس پر نصب کر کے زحر بن قیس کے ہاتھ

یزید کے پاس بھیجدیا۔ غاز بن ربیعہ کہتا ہے۔ جس وقت زحر بن قیس
پہنچا۔ میں یزید کے پاس بیٹھا تھا۔ یزید نے اس سے کہا "کیا خبر ہے؟"
قاصد نے جواب دیا۔ "فتح و نصرت کی بشارت لایا ہوں حسینؑ
بن علیؑ اپنے اٹھارہ اہل بیت اور ساٹھ حامیوں کے ساتھ پہونچے۔ ہم
نے انھیں بڑھ کر روکا۔ اور مطالبہ کیا کہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دیں
ورنہ لڑائی لڑیں۔ انھوں نے اطاعت پر لڑائی کو ترجیح دی۔ چنانچہ ہم
نے طلوع آفتاب کے ساتھ ہی ان پر حملہ بول دیا۔ جب تلواریں ان
کے سروں پر پڑنے لگیں۔ تو اس طرح ہر طرف بھاگنے اور جھاڑیوں اور
گڑھوں میں چھپنے لگے۔ جس طرح کبوتر باز سے بھاگ کر چھپتے ہیں
آخر ہم نے ان سب کا قلع قمع کر دیا۔ اس وقت ان کے رخسار غبار سے
میلے ہو رہے ہیں۔ ان کے جسم دھوپ کی شدت اور ہوا کی تیزی سے
خشک ہو رہے ہیں۔ گدھوں کی خوراک بن گئے ہیں۔"

راوی کہتا ہے یزید نے یہ سنا۔ تو اس کی آنکھیں
پُرنم ہونے لگا اشکبار ہو گئیں۔ کہنے لگا۔ بغیر قتل حسینؑ
کے بھی میں تمہاری اطاعت سے خوش ہو سکتا تھا۔ ابن سمیہ
(یعنی ابن زیاد) پر خدا کی لعنت! واللہ اگر میں وہاں ہوتا۔ تو حسینؑ
سے ضرور درگذر کر جاتا۔ خدا حسینؑ کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے
قاصد کو یزید نے کوئی انعام نہیں دیا۔

(ابن جریر، کامل۔ تاریخ کبیر ذہبی)

یزید کا تاثر یزید کے غلام قاسم بن عبدالرحمان سے روایت ہے کہ جب حضرت حسین اور ان کے اہل بیت کے سر یزید کے سامنے رکھے گئے۔ تو اس نے یہ شعر پڑھا۔

(تلواریں ایسوں کے سر پھاڑتی ہیں جو ہمیں عزیز ہیں۔ حالانکہ دراصل وہی حق فراموش کرنیوالے ظالم تھے۔)

پھر کہا۔ "واللہ اے حسین اگر میں وہاں ہوتا۔ تو تجھے ہرگز قتل نہ کرتا۔"

یزید اور امام زین العابدین پھر یزید نے شام کے سرداروں کو اپنی مجلس میں بلایا۔ اہل بیت کو بھی بٹھایا۔ اور امام زین العابدین سے مخاطب ہوا۔ اے علی! تمہارے ہی باپ نے میرا رشتہ کاٹا۔ میرا حق بھلایا۔ میری حکومت چھیننا چاہی۔ اس پر خدا نے اس کے ساتھ وہ کیا۔ جو تم دیکھ چکے ہو۔"

امام زین العابدین نے اس کے جواب میں یہ آیت پڑھی

ما اصاب من مصیبت فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأها ان ذلك علی اللہ یسیر۔ لکیلا تاسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم ان اللہ لا یحب کل

مختالٍ فخورٍ[1]

یہ جواب یزید کو ناگوار گذرا۔ اس نے چاہا کہ اپنے بیٹے خالد سے جواب دلوائے۔ مگر خالد کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ تب یزید نے خالد سے کہا۔ "کہتا کیوں نہیں۔ ما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم و یعفو عن کثیر[2]"

پھر یزید دوسرے بچوں اور عورتوں کی طرف متوجہ ہوا۔ انھیں اپنے قریب بلا کر بٹھایا۔ ان کی ہیئت خراب ہو رہی تھی۔ دیکھ کر متاسف ہوا اور کہنے لگا۔ خدا ابن مرجانہ کا برا کرے۔ اگر تم سے اس کا رشتہ ہوتا۔ تو تمھارے ساتھ ایسا سلوک نہ کرتا۔ نہ اس حال سے تمھیں میرے پاس بھیجتا۔"

حضرت زینبؑ کی بیباکانہ گفتگو

حضرت فاطمہ بنت حسینؑ کا بیان ہے کہ جب ہم یزید کے سامنے بٹھائے گئے۔ تو اس نے ہم پر ترس ظاہر کیا

---

[1] تمہاری کوئی مصیبت نہیں آتی جو پہلے سے لکھی نہ گئی ہو۔ یہ خدا کے لئے بہت آسان ہے۔ یہ اس لئے کہ نقصان پر افسوس نہ کرو۔ اور فائدہ پر خوش نہ ہو۔ خدا مغروروں اور فخر کرنیوالوں کو ناپسند کرتا ہے

[2] جو مصیبت تمہیں آتی ہے۔ خود تمہارے اپنے ہاتھوں آتی ہے۔ اور بہت سی غلطیاں تو خدا معاف کر دیتا ہے۔

ہمیں کچھ دینے کا حکم دیا۔ بڑی مہربانی سے پیش آیا۔ اسی اثنا میں ایک سرخ رنگ کا شامی کھڑا ہوا اور کہنے لگا ۔ "امیر المومنین! یہ لڑکی مجھے عنایت کر دیجئے" اور میری طرف اشارہ کیا۔ اس وقت میں کمسن اور خوبصورت تھی۔ میں خوف سے کانپنے لگی۔ اور اپنی بہن زینب کی چادر پکڑلی۔ وہ مجھ سے بڑی تھیں۔ زیادہ سمجھدار تھیں۔ جانتی تھیں کہ یہ بات نہیں ہو سکتی انھوں نے پکار کر کہا "تو کمینہ ہے نہ تجھے اس کا اختیار ہے اور نہ اسے (یزید کو) اس کا حق ہے"

اس جرأت پر یزید کو غصہ آگیا۔ کہنے لگا "تو جھوٹ بکتی ہے۔ واللہ مجھے یہ حق حاصل ہے۔ اگر چاہوں تو ابھی کر سکتا ہوں"

زینب نے کہا۔ "ہرگز نہیں۔ خدا نے تمہیں یہ حق ہرگز نہیں دیا یہ دوسری بات ہے کہ تم ہماری ملت سے نکل جاؤ۔ اور ہمارا دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرلو"

یزید اور بھی زیادہ خفا ہو کر کہنے لگا۔ "دین سے تیرا باپ اور تیرا بھائی نکل چکا ہے"

زینب نے بلا تامل جواب دیا۔ "اللہ کے دین سے میرے باپ کے دین سے، میرے بھائی کے دین سے۔ میرے نانا کے دین سے تو نے تیرے باپ نے تیرے دادا نے ہدایت پائی ہے"

یزید چلایا۔ "اے دشمن خدا تو جھوٹی ہے"

زینب بولیں۔ "تو زبردستی حاکم بن بیٹھا ہے۔ ظلم سے گالیاں

بیتا ہے۔ اپنی قوت سے مخلوق کو دباتا ہے۔"

حضرت فاطمہ بنت علی کہتی ہیں۔ یہ گفتگو سن کر شاید یزید شرمندہ ہو گیا۔ کیونکہ پھر کچھ نہ بولا۔ مگر وہ شامی پھر کھڑا ہوا۔ اور وہی بات کہی جس پر یزید نے غضبناک آواز میں اسے ڈانٹ بتائی۔ "دور ہو کمبخت خدا تجھے موت کا تحفہ بخشے۔"

یزید کا مشورہ

دیر تک خاموشی رہی۔ پھر یزید شامی رؤسا اور امراء کی طرف متوجہ ہوا۔ اور کہنے لگا "ان لوگوں کے بارے میں کیا مشورہ دیتے ہو۔ بعضوں نے سخت کلامی کے ساتھ بدسلوکی کا مشورہ دیا۔ مگر نعمان بشیر نے کہا۔ "ان کے ساتھ وہی کیجئے جو رسول اللہ انھیں اس حال میں دیکھ کر کرتے۔"

حضرت فاطمہ بن حسینؓ نے یہ سن کر کہا۔ "اے یزید! یہ رسول اللہ کی لڑکیاں ہیں۔"

اس نسبت کے ذکر سے یزید کی طبیعت بھی متاثر ہو گئی۔ وہ اور درباری اپنے آنسو نہ روک سکے۔ بالآخر یزید نے حکم دیا کہ ان کے قیام کے لئے علیحدہ انتظام کر دیا جائے۔"

یزید کی بیوی کا غم

اس اثنا میں واقعہ کی خبر یزید کے گھر میں عورتوں کو بھی معلوم ہو گئی۔ ہند بنت عبداللہ یزید کی بیوی نے منہ پر نقاب ڈالا۔ اور باہر آ کر یزید سے کہا "امیر المومنین کیا حسین بن فاطمہ بنت رسول کا سر آیا ہے۔"

یزید نے کہا "ہاں! تم خوب رو۔ بین کرو۔ رسول اللہ کے نواسے اور قریش کے اصیل پر ماتم کرو۔ ابن زیاد نے جلدی کی قتل کر ڈالا۔ خدا اسے بھی قتل کرے۔"

حسینؓ کی اجتہادی غلطی

اس کے یزید نے حاضرین مجلس سے کہا۔ "تم جانتے ہو یہ سب کس کا نتیجہ ہے؟ یہ حسین کے اجتہاد کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے سوچا۔ میرے باپ یزید کے باپ سے افضل ہیں۔ میری ماں یزید کی ماں سے افضل ہے۔ میرے نانا یزید کے نانا سے افضل ہیں۔ اور میں خود بھی یزید سے افضل ہوں۔ اس لئے حکومت کا بھی یزید سے زیادہ مستحق ہوں۔ حالانکہ ان کا یہ سمجھنا کہ ان کے والد میرے والد سے افضل تھے صحیح نہیں۔ علی اور معاویہ نے باہم جھگڑا کیا۔ اور دنیا نے دیکھ لیا کہ کس کے حق میں فیصلہ ہوا۔ رہا ان کا یہ کہنا کہ ان کی ماں میری ماں سے افضل تھی تو بلاشبہ یہ ٹھیک ہے۔ فاطمہ بنت رسول اللہ میری ماں سے کہیں افضل ہیں۔ اسی طرح ان کے نانا میرے نانا سے افضل تھے تو خدا کی قسم کوئی بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والا رسول اللہ سے افضل بلکہ رسول اللہ کے برابر کسی انسان کو نہیں سمجھ سکتا۔ حسین نے اجتہاد نے غلطی کی۔ وہ یہ آیت بالکل بھول گئے۔

اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء و تعز من تشاء و تذل من تشاء بیدک الخیر انک

علی کل مشئی قدیر۔
پھر اہل بیت کی خواتین یزید کے محل میں پہونچائی گئیں۔ خاندان معاویہ کی عورتوں نے انہیں اس حال میں دیکھا۔ تو بے اختیار رونے پیٹنے لگیں۔

یزید کی سعی تلافی

پھر یزید آیا۔ تو فاطمہ بنت حسینؓ نے اس سے کہا۔ "اے یزید کیا رسول اللہ کی لڑکیاں کنیزیں ہو گئیں۔؟"

یزید نے جواب دیا۔ "اے میرے بھائی کی بیٹی ایسا کیوں ہونے لگا۔؟"

فاطمہ نے کہا "بخدا ہمارے کان میں ایک بھی بالی نہیں چھوڑی گئی۔"

یزید نے کہا۔ تم لوگوں کا جتنا گیا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ میں تمہیں دوں گا۔" جس نے اپنا جتنا نقصان بتایا۔ اس سے دگنا تگنا دیدیا گیا۔

یزید کا دستور تھا کہ روز صبح شام کے کھانے میں علی بن حسینؓ کو اپنے ساتھ شریک کیا کرتا۔ ایک دن حضرت حسنؓ کے کمسن بچے عمرو کو بھی بلایا۔ اور ہنسی سے کہنے لگا "تو اس سے لڑے گا۔؟" اور اپنے لڑکے خالد کی طرف اشارہ کیا۔ عمرو بن حسن نے اپنے بچپنے کے بھولے پن سے جواب دیا۔ یوں نہیں ایک چھری مجھے دو اور ایک چھری اسے

پھر ہماری لڑائی دیکھو۔"

یزید کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اور عمرو بن حسینؑ کو گود میں اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور کہا "سانپ کا بچہ سانپ ہی ہوا کرتا ہے۔"

یزید کی زود پشیمانی

یزید نے اہل بیت کو کچھ دن اپنا مہمان رکھا۔ اپنی مجلسوں میں ان کا ذکر کرتا۔ اور بار بار کہتا۔ "کیا ہرج تھا۔ اگر میں خود تھوڑی سی تکلیف گوارہ کر لیتا۔ حسین کو اپنے گھر میں اپنے ساتھ رکھتا۔ ان کے مطالبے پر غور کرتا۔ اگرچہ اس سے میری قوت میں کمی ہی کیوں نہ ہو جاتی لیکن اس سے رسول اللہ صلعم کے حق اور رشتہ داروں کی تو حفاظت ہوتی۔ خدا کی لعنت! ابن مرجانہ (یعنی ابن زیاد) پر جس نے حسین کو لڑائی پر مجبور کیا۔ حسین نے کہا تھا۔ میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیں گے۔ یا مسلمانوں کی سرحد پر جا کر جہاد میں مصروف ہو جائیں گے۔ مگر ابن زیاد نے ان کی کوئی بات بھی نہیں مانی۔ اور قتل کر دیا۔ ان کے قتل سے تمام مسلمانوں میں مجھے مبغوض بنا دیا خدا کی لعنت ابن مرجانہ پر! خدا کا غضب ابن مرجانہ پر!

اہل بیت کو رخصت کرنا

جب اہل بیت کو مدینہ بھیجنے لگا۔ تو امام زین العابدین سے ایک مرتبہ اور کہا "ابن مرجانہ پر خدا کی لعنت! واللہ اگر میں حسینؑ

کے ساتھ ہوتا۔ اور وہ میرے سامنے اپنی کوئی شرط بھی پیش کرتے۔ تو میں اسے ضرور منظور کر لیتا۔ میں ان کی جان ہر ممکن ذریعہ سے بچاتا۔ اگرچہ ایسا کرنے میں خود میرے کسی بیٹے کی جان چلی جاتی۔ لیکن خدا کو وہی منظور تھا جو ہو چکا دیکھو۔ مجھ سے برابر خط و کتابت کرتے رہنا۔ جو ضرورت پیش آئے مجھے خبر دینا۔"

بعد میں حضرت سکینہ برابر کہا کرتی تھیں۔ "میں نے کبھی کوئی نا شکر انسان یزید سے زیادہ اچھا سلوک کرنے والا نہیں دیکھا۔"

اہل بیت کی فیاضی

یزید نے اہل بیت کو اپنے ایک معتبر آدمی اور فوج کی حفاظت میں رخصت کر دیا۔ اس شخص نے راستہ بھر ان مصیبت زدوں سے اچھا برتاؤ کیا۔ جب یہ منزل مقصود پر پہونچ گئے۔ تو حضرت زینب بنت علی اور حضرت فاطمہ بنت حسین نے اپنی چوڑیاں اور کنگن اسے بھیجے اور کہا "یہ تمہاری نیکی کا بدلہ ہے۔ ہمارے پاس کچھ نہیں کہ تمہیں دیں۔"

اس شخص نے زیور واپس کر دیئے اور کہلایا۔ "واللہ میرا یہ برتاؤ کسی دنیاوی طمع سے نہ تھا۔ بلکہ رسول اللہ صلعم کے خیال سے تھا۔"

مدینہ میں ماتم

اہل بیت کے آنے سے بہت پہلے مدینہ میں یہ

جانگسل خبر پہنچ چکی تھی۔ بنی ہاشم کی خاتونوں نے سنا تو گھروں سے چلاتی ہوئی نکل آئیں۔ حضرت عقیل بن ابی طالب کی صاحبزادی آگے آگے تھیں۔ اور یہ شعر پڑھتی جاتی تھیں۔

(کیا کہو گے جب نبی تم سے سوال کریں گے کہ اے وہ جو
سب سے آخری امت ہو)

(تم نے میری اولاد اور خاندان سے میرے بعد کیا
سلوک کیا۔ کہ ان میں سے بعض قیدی ہیں اور بعض
خون میں نہائے پڑے ہیں۔)

مرثیہ حضرت حسین کی شہادت پر بہت سے لوگوں نے مرثیے کہے۔ سلیمان بن قتہ کا مرثیہ بہت زیادہ مشہور ہوا۔

(میں خاندان محمدؐ کے گھروں کی طرف سے گذرا مگر
وہ کبھی ایسے نہ تھے۔ جیسے اس دن جب ان کی حرمت
توڑی گئی۔)

(خدا ان مکانوں اور مکینوں کو دور نہ کرے۔ اگرچہ
وہ اب اپنے مکینوں سے خالی پڑے ہیں۔)

(کربلا میں ہاشمی مقتول کے قتل نے مسلمانوں کی گردنیں
ذلیل کر ڈالیں۔)

ان مقتولوں سے دنیا کی امیدیں وابستہ تھیں۔ مگر وہ

مصیبت بن گئے۔ آہ یہ مصیبت کتنی بڑی اور سخت ہے
دکیا تم نہیں دیکھتے کہ زمین حسین کے فراق میں بیمار
ہے اور دنیا کانپ رہی ہے۔)
دآسمان بھی اس کی جدائی پر روتا ہے۔ ستارے
بھی ماتم کرتے اور سلام بھیج رہے ہیں۔)

از

مولانا ابوالکلام آزاد

حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا واقعہ تاریخ اسلام میں ہمیشہ خون آلود حرفوں میں لکھا گیا۔ اور اشکبار آنکھوں سے پڑھا گیا ہے۔ لیکن اس درد انگیز واقعہ اور ماتم خیز حادثہ کے اندر شریعت اسلامیہ کی بے شمار بصیرتیں مضمر تھیں جن کو خون کی ان چادروں نے چھپا دیا اور ہزاروں اسوۂ ہائے حسنہ مخفی تھے۔ جن کو آنسوؤں کے سیلاب بہالے گئے اس لئے اب ہم کو قدیم زمانے کی مجلس ہائے ماتم میں ایک نئے حلقہ ماتم کا اضافہ کرنا چاہیئے۔ اور خون آلود آنسوؤں کا جو چشمہ ہمارے زخم رسیدہ دلوں سے ابل رہا تھا۔ اس کو کچھ دیر کے لئے ملتوی کر کے خود واقعہ شہادت کو اسرار شریعت اسلامیہ کا سرچشمہ بنانا چاہیئے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر ماتم کرنے کا یہ ایک نتیجہ خیز طریقہ ہوگا۔ اور شریعت نے امت محمدیہ

کو اسی طریق ماتم کی ہدایت فرمائی ہے۔

اسلاف پرستی کے غیر اسلامی طریقے

دنیا میں اسلاف پرستی کا فطری مادہ ہر قوم کے اندر ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اسی بناء پر تمام قوموں نے اپنے اپنے اسلاف کا ماتم مختلف طریقوں سے منایا ہے۔ اور ان کے اعمال کو آئندہ نسل کی عبرت و بصیرت کے لئے زندہ رکھنا چاہا ہے لیکن ان تمام طریقوں میں جو طریقہ سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ وہ وہی ہے۔ جس کی بنیاد دنیا کی بت پرستی نے رکھی۔ اور در اصل اصنام پرستی کی زنجیر عمل کی پہلی اور آخری کڑی اسی کو سمجھنا چاہیئے پہلی اس لئے کہ بسا اوقات انسانوں نے اسی راہ سے اصنام پرستی کی منزل پائی اور آخری اس لئے کہ بت پرستی خود تو چلی گئی۔ مگر اپنا نقش قدم اس شکل میں اب تک چھوڑ گئی ہے

ہمارا اشارہ اسلاف پرستی کے اس طریقہ کی طرف ہے۔ جس کی بناء پر مشاہیر ملک اور قوم کے مجسّمے (اسٹیچوز) بنائے جاتے ہیں اور ان کو اس لئے نصب کیا جاتا ہے کہ ان کے ذریعہ قوم کو ہمیشہ مشاہیر کی یاد دلائی جائے۔ اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی ہدایت ملے۔"

اگرچہ اسلاف پرستی کا یہ نہایت قدیم طریقہ تھا۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک اس قسم کے متعدد مجسمے قائم ہو چکے

تھے۔ اور ان کی علانیہ پرستش کی جاتی تھی۔ لیکن یونان و مصر نے
ان مجسموں پر تمدن و تہذیب کا آب و رنگ چڑھا کر ان کو اور بھی
شاندار و دلفریب بنا دیا۔ آج یورپ بانیان تہذیب و تمدن کے
دیوتاؤں کی جو نمائش مجسموں کی شکل میں کر رہا ہے۔ ان کے اندر
یونان کی اسی قدیم تہذیب کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ ہندوؤں
کی مذہبی سطح پر بھی تصویروں کی جو صفیں نظر آتی ہیں۔ ان میں بھی
اسی کی جھلک پائی جاتی ہے۔

اسلامی انقلاب

لیکن اسلام ایک دین خالص تھا جو
توحید خالص کو قائم کرنا چاہتا تھا
اور انسانی عظمت کی ان تمام راہوں کا ہمیشہ کے لئے دروازہ
بند کر دینا چاہتا تھا۔ جو کسی حال میں بھی الٰہی عظمت کے تقدس
تک پہنچ سکتی تھیں۔ یا قریب ہو سکتی تھیں۔ پس وہ کسی طرح
بھی تمام ذکر دیوتا سے عظمت کا ایسا طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تھا
جس میں پڑ کر دنیا بار بار ٹھوکر کھا چکی تھی۔

اسلام نے ظاہر ہوتے ہی دنیا کے تمام اعمالات و تصورات پر
نظر ڈالی اور ہر عمل کی حقیقت و روح کو لے لیا۔ اور غیر مناسب و نا
موزوں جسم و لباس کو چھوڑ دیا۔

وقت نے جن حقیقتوں کو تاریک پردوں میں چھپا دیا تھا
وہ دفعۃً چاک ہو گئے۔ اور جہالت نے جن مورتیوں کو تراشا

کے ڈھیر میں گم کردیا تھا۔ وہ ان سے الگ ہوکر دنیا کے دامن مراد میں لگ گئے۔ غیر معتدل تمدن نے جن کھلی ہوئی بصیرتوں کو خوشنما چادروں کے آب ورنگ میں راز سربستہ کی طرح مقفل کردیا تھا۔ وہ یکسر فاش ہوگئے۔ اور حقیقت آفتاب کی طرح علانیہ بے نقاب ہوکر ہر انسان کو نظر آگئی۔ قرآن حکیم نے اسی انقلاب کو ایک مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

اللہ ولی الذین آمنوا یخرجکم من الظلمت الی النور والذین کفروا اولیاء ھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمت (۲۵۸ ،۱۲)	خدا مسلمانوں کا دوست اور ساتھی ہے ان کو ہر طرح کی انسانی تاریکیوں سے نکال کر فطرۃ صالحہ کی ربانی روشنی میں لاتا ہے۔ مگر کفار کے دوست انکے طاغوت ہیں۔ جو ان کو خدا کی بخشی ہوئی روشنی سے نکال کر جہل وضلالت کی اندھیری کی طرف لے جاتا ہے۔

یہ ایک عظیم الشان انقلاب تھا جس کی جھلک

قیام یادگار کا اسلامی طریقہ

اسلام کی تمام تعلیمات میں نظر آتی ہے۔ اور مشاہیر پر ماتم کرنے کا طریقہ بھی اس سے مستثنےٰ نہیں۔ چنانچہ قدما کی یادگار قائم کرنے اور ان کے اعمال وآثار کے زندہ رکھنے کا جو طریقہ زمانہ قدیم سے چلا آتا تھا اسلام نے اس میں بھی ایک روحانی انقلاب پیدا کردیا۔ اس نے

مسلمانوں کو مجسموں کی شکل میں اسلاف پرستی کی اجازت نہیں دی کیونکہ وہ بت پرستی تک منتج ہوتی ہے۔ اور اسلام زندہ انسانوں کے شرف کو پتھروں کے آگے نہیں جھکانا چاہتا۔ مگر اس نے مشاہیر کرام اور اسلاف صالحین کے نمونوں کے فوائد عظیمہ کو بھی ضائع ہونے نہ دیا۔ اور ان کے اثر اس طرح حی و قائم کر دیا کہ ہر مومن کے آگے ان کی عملی زندگی کے نمونے پیش کر دیئے۔ اور کہا کہ دن میں جب پانچ بار خدا کے حضور آؤ۔ تو صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت مانگو۔ ساتھ ہی تشریح کر دی کہ صراط مستقیم انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی راہ علم و عمل ہے۔ اور اس لئے ان کے نمونے ہر وقت تمہارے سامنے رہنے چاہئیں۔

پس ماتم کی وحشت نے جن تاریک پردوں کو ڈال کر اصل حقیقت کو چھپا دیا تھا۔ اور تمدن و تہذیب نے ان پردوں پر نظر فریب رنگ چڑھا کر جن تعبیروں کو گم کر دیا تھا۔ اسلام نے ان سب کو چاک چاک کر دیا۔ اور مغز حقیقت جن چھلکوں میں چھپا ہوا تھا۔ ان سے نکل کر علانیہ آشکارا ہو گیا۔

قرآن حکیم میں انبیائے سابقین کے جو قصص مذکور ہیں۔ ان کے اندر در حقیقت انہیں بصائر و حکم کی روح مضمر ہے۔ جو شعائر کے قالب میں حلول کر گئے بالکل بے اثر اور محض ظاہر فریب ہو گئی تھی۔ قرآن نے بجائے خدا اکابر کی یادگاروں کے قائم کرنے کے اصل

مقصد کو "اسوۂ حسنہ" کے جامع لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اور مسلمانوں کو جابجا اس پر توجہ دلاتا ہے۔ چنانچہ تم بار بار انہیں صفحات پر پڑھ چکے ہو کہ اس نے ابراہیم علیہ السلام کے نمونۂ حیات کو مسلمانوں کا قبلہ وجہ کعبہ انظار قرار دیا۔

قد کان لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم و الذین معہ (۶۰:۴)	تمہارے لئے حضرت ابراہیم کی حیات طیبہ میں اور ان کی زندگی میں جو ان کے ساتھی ہیں۔ پیروی کے لئے بہترین نمونہ رکھا گیا ہے

واقعہ شہادت کی بصیرتیں

اسی بنا پر اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے جو اسلاف پرستی کی صحیح اصول پر تعلیم دیتا ہے۔ اور اسی صحیح اصول کے مطابق چاہیے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے واقعۂ شہادت کے اندر عزم و استقلال، صبر و ثبات، استبداد شکنی، قیام جمہوریت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جو عظیم الشان بصیرتیں موجود ہیں۔ ان کی یاد کو ہر وقت تازہ رکھیں۔ اور کم از کم سال میں ایک بار اس مذہبی قربانی کی روح کو تمام قوم میں جاری و ساری کر دیں۔۔۔

لیکن ان بصیرتوں کے علاوہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی ذات میں ایک اور عظیم الشان بصیرت بھی موجود ہے۔ جس کا سلسلہ

مذہب کی ابتدائی تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ اور اس کی آخری کڑی اسلام کی تکمیل میں جاکر مل جاتی ہے۔

مذہب کی ابتدائی تاریخ اور عالمِ بیکسی

تاریخ کی ابتداء عجیب بے کسی کی حالت میں ہوئی۔ ہم نے دنیا کے سخت سے سخت معرکوں میں باپ کو بیٹے کا مشیر، بھائی کو بھائی کا حامی، بی بی کو شوہر کا مددگار پایا ہے لیکن صرف مذہب ہی کا روحانی عالم ایک ایسا عالم ہے جہاں باپ کو بیٹے نے، بھائی کو بھائی نے، شوہر کو بی بی نے چھوڑ دیا ہے، بلکہ ان کی مصیبتوں میں اور بھی اضافہ کیا ہے۔

یہی سبب ہے کہ خاندانِ نبوت ہمیشہ اعزہ و اقارب کی اعانت سے محروم رہا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ایک مدت تک شب و روز اپنی قوم کو دعوتِ توحید دی۔ اور قوم نے تمرد اور سرکشی و عناد سے ان کی دعوتِ حق کو رد کر دیا۔ ان سے علیحدگی اختیار کر لی اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

قال رب انی دعوت	نوح نے عرض کیا۔ خداوندا میں نے
قومی لیلا و نہارا	شب و روز دعوتِ حق کی لیکن ان کو
فلم یزدھم دعائی	الٹا اثر ہوا کہ وہ مجھ سے اور

الا فرارا وانی کلما دعوتھم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی اذانھم واستغشوا ثیابھم واصروا واستکبروا استکبارا (۱۵ : ۷۱)

زیادہ بھاگنے لگے۔ میں نے جب ان کو تیری مغفرت کے لیئے پکارا انھوں نے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں۔ اپنے کپڑوں میں لپٹ گئے کہ ان کی آواز تیرے تک نہ پہنچ جائے۔ آہ! یہ حق ناشناس قوم ہمیشہ سخت ہٹ دھرمی اور باطل پرستانہ گھمنڈ کا اظہار کرتی رہی۔)

لیکن اس پیغمبرانہ آواز کی صدائے بازگشت صرف ان کی قوم ہی کے در و دیوار سے ٹکرا کر ناکامیاب واپس نہیں آئی۔ بلکہ خود ان کے گھر کے در و دیوار نے بھی اس کو ٹھوکر لگائی۔ اور خاندان نبوت کے چشم و چراغ یعنی ان کے بیٹے نے بھی اس نور کو قبول نہ کیا۔ آخری وقت میں حضرت نوح علیہ السلام نے پھر اپنے بیٹے کو خدا کی پناہ میں بلایا۔ لیکن اس وقت بھی اس کا گوش نصیحت نیوش وا نہ ہوا۔ اس لیئے وہ بھی تمام قوم کے ساتھ عذاب الٰہی کی طوفان خیز موجوں میں بہہ گیا۔

ونادی نوح ابنہ وکان فی معزل یا بنی ارکب معنا ولا تکن مع الکافرین قال ساوی الی جبل

اور نوحؑ نے اپنے بیٹے کو جو اپنے شامت اعمال کی وجہ سے ان سے علیحدہ تھا پکارا کہ اے بیٹے ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جا۔ اور کافروں کا ساتھ نہ

یعصمنی من الماء قال لا عاصم الیوم من امر اللہ الا من رحم۔ وحال بینھما الموج فکان من المغرقین (۱۱ - ۴۲)

دے۔ اس نے کہا کہ میں پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا۔ اور وہ مجھے اس طوفان سے بچالے گا۔ نوح نے کہا تو کس ضلالت عقل میں مبتلا ہے؟ آج خدا کے عذاب سے کوئی بھی نہ بچا سکے گا۔

چنانچہ نوح کی پکار کچھ بھی سودمند نہ ہوئی۔ اور اس کے اور اس کے بیٹے کے درمیان موج حائل ہو گئی۔ اور تمام لوگوں کے ساتھ وہ بھی ڈوب گیا۔

حضرت لوط علیہ السلام کے تمام خاندان نے اگرچہ ان کا ساتھ دیا۔ لیکن خود ان کی بیوی ان سے علیحدہ ہو کر تمام قوم کے ساتھ عذاب الہٰی میں شامل ہو گئی۔

قالوا انا ارسلنا الی قوم مجرمین الا آل لوط انا لمنجوھم اجمعین الا امرأتہ قدرنا انھا لمن الغابرین (۱۵ - ۵۸)

فرشتگان عذاب نے کہا۔ ہم اس گنہگار قوم کو اس کے اعمال بد کا نتیجہ دکھلانے کے لئے بھیجے گئے ہیں ہمارے عذاب سے صرف لوط خاندان محفوظ رہے گا۔ اور ان میں سے بھی ان کی بی بی قوم کے ساتھ عذاب الہٰی میں شامل کرلی جائے گی کیونکہ وہ کافرہ ہے۔

لیکن حضرت ابراہیم علیہ ا
تاریخ مذہب میں انقلاب کے زمانہ سے خاندا
نبوت میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہوا۔ حضرت نوح علیہ السلا
کا بیٹا ان سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بی بی
ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ لیکن اس دورِ ابراہیمی میں بیٹے نے
باپ کی۔ بی بی نے شوہر کی۔ بھائی نے بھائی کی دعوت حق پر لبیک
کی صدا بلند کی۔ اور اس دعوت کی اشاعت میں جو جو مصیبتیں ان پر
آئیں۔ ان میں برابر کے شریک رہے۔

(۱) سب سے پہلے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے اس جہادِ ر
کی طرف قدم بڑھایا۔ اور اپنے شوہر کے ساتھ اپنے لختِ جگر کو ایک
"وادی غیر ذی زرع" میں ڈال دیا۔ جہاں کئی سو میل تک آب و
گیاہ کا پتہ نہ تھا۔ یہ اسی سخت امتحان کی پہلی منزل تھی۔ جس کے
خداوند تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو انتخاب کیا تھا
چنانچہ جب اس آخری امتحان کا وقت آیا۔ تو انھوں نے باپ کے آ
سر اطاعت خم کر دیا۔

فلما بلغ معہ السعی قال	جب اسماعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم کے سا
یا بنی انی اری فی	چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے۔ تو انھوں نے ایک دن کہ
المنام انی اذبحک فانظر	اے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا
ماذا تری ؟ قال	کہ گویا تمھیں راہِ حق میں ذبح کر رہا ہوں

یا ابت افعل ما تؤمر ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین۔ فلما اسلما وتلہ للجبین۔ ونادیناہ ان یا ابراھیم قد صدقت الرؤیا انا کذلک نجزی المحسنین ان ھذا لھو البلاء المبین۔ (۳۷: ۹۹...)

میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ تم بھی اس پر غور کرو۔ کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔؟ بیٹے نے بلا تامل کہا کہ ہائے میرے باپ! اس خواب سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی جانب سے ایک اشارہ ہے۔ پس آپ حکم الٰہی کو پورا کیجئے۔ مجھے انشاء اللہ صبر کرنے والوں اور ثابت قدموں میں پائیے گا۔

جب باپ بیٹے دونوں خدا کے آگے جھک گئے۔ اور باپ نے ذبح کے لئے بیٹے کو زمین پر پچھاڑا۔ تو اس وقت ہم نے آواز دی۔ "اے ابراھیم! بس کرو۔ تم نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا۔ ہم احسان کرنے والوں کو اسی طرح بدلا دیتے ہیں۔ دراصل یہ ایک بہت ہی بڑی قربانی تھی۔ جس کی تعمیل کے لئے تم تیار ہو گئے تھے۔

(۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی ان کے خاندان کی اعانت و رفاقت شریک رہی۔ چنانچہ جب ان کو شعلۂ طور کی زبان سے بشارت نبوت دی۔ تو ان کی بی بی ان کے ساتھ تھیں۔ بلکہ انھیں کے لئے وہ آتش کردہ طور سے آگ لینے

گئے تھے۔

فلما قضی موسی الاجل وسار باھلہ آنس من جانب الطور نارا۔ قال لاھلہ امکثوا انی آنست نارا لعلی آتیکم منھا بخبر او جذوة من النار لعلکم تصطلون۔

(۲۹-۲۸)

جب موسےٰ مدین سے اپنی بی بی کو لیکر چلے۔ تو ان کو کوہِ طور کے دامن آگ کی روشنی نظر آئی انہوں نے اپنی بیوی سے کہا۔ یہیں ٹھہرو۔ میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔ اس کا پتہ لگاتا ہوں شاید تمہارے تاپنے کے لئے آگ حاصل کرسکوں۔

لیکن وادیٔ ایمن میں جاکر معلوم ہوا کہ یہ آگ کا شعلہ نہ تھا بلکہ وہ ایک برق خاطف تھی۔ جو فرعون کے خرمن ظلم و استبداد پر گرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ جب خدا نے عصا اور ید بیضا کی صورت میں ان کو یہ صاعقۂ ہلاکت دیا۔ اور انھوں نے اپنے بھائی ہارون کی اعانت کا سوال کیا۔ تو خدا نے اس کو پورا کیا۔

قال سنشد عضدك باخيك ونجعل لكما سلطانا۔

خدا نے کہا کہ میں تیرے دست و بازو کو تیرے بھائی کی اعانت سے قوی کردوں گا۔ اور تم دونوں کو فرعون پر غالب کردوں گا۔

چنانچہ حضرت ہارون علیہ السّلام نے آغاز کار سے انجام کار تک حضرت موسےٰ کا ساتھ دیا۔ اور وہ دعوت موسوی کے ہمیشہ شریک و امین رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اس سلسلہ کو اور ترقی ہوئی۔

(۲) پہلے خدا کے ایک صالح بندے نے اپنے بیٹے کو خدا کی مرضی پر قربان کرنا چاہا تھا۔ لیکن اب وہ وقت آیا کہ خود حضرت مسیح علیہ السّلام نے قربانی کے جام مقدس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ان کے سولی کا جو تختہ تیار کیا گیا تھا۔ اس کی طرف بلا کسی باک کے بڑھے۔

وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم (۱۵۶ : ۴)۔

اور ان لوگوں نے نہ تو عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا نہ پھانسی دی۔ بلکہ ان پر اس قربانی کی حقیقت مشتبہ ہو گئی۔

ما قبل زمانہ اسلام میں قربانیوں کی نوعیت لیکن اسلام کے زمانہ تک خدا کی راہ میں جو قربانیاں ہوتی تھیں۔ وہ شخصی حیثیت رکھتی تھیں۔ یعنی انبیاء نے شخصی طور پر خدا کی ذات پر اپنے بیٹے یا اپنے آپ کو قربان کر دیا تھا۔ جہاد کی یہ ابتداء تھی۔ مگر اس کی تکمیل شریعت اسلام پر موقوف تھی۔ چنانچہ اسلام نے جس طرح عقائد و عبادت اور معاش و معاد میں تمام قدیم مذاہب کی تکمیل کی

اسی طرح جہاد کی حقیقت کو بھی مکمل اور واضح کردیا۔ اب تک کسی پیغمبر کے خاندان نے جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ شخصی طور پر بھی جو قربانیاں کی گئیں۔ وہ راہ ہی میں روک لی گئیں۔ حضرت ابراہیم نے اپنے لخت جگر کو خدا کی نذر کرنا چاہا۔ لیکن اس کا موقعہ بھی نہ آیا۔ حضرت عیسےٰ سولی کی طرف بڑھے۔ لیکن بچا لئے گئے۔ آج تک تمام خاندان نبوت نے متفقہ طور پر اس میں شرکت بھی نہیں کی تھی۔ اور اس کی کوئی نظیر تمام سلسلۂ انبیاء میں نہیں نظر آتی تھی کہ صرف بھائی، صرف بیٹا۔ صرف بیوی ہی نے مقصد میں ساتھ نہ دیا ہو۔ بلکہ بلاتمیز خاندان نبوت کے اکثر اعضاء و ارکان راہ حق میں قربان ہوئے ہیں۔

حادثہ کربلا کی اہمیت

یزید کی شخصی خلافت کی بیعت کے لئے جو ہاتھ بڑھتے تھے۔ وہ اسلام کی جمہوریت کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے۔ اور مذہب کی قربانیاں صرف امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے ہوا کرتی تھیں۔ اس لئے جب اسوۂ ابراہیمی کے زندہ کرنے کا ٹھیک وقت آگیا۔ تو خاندان نبوت کے زن و مرد، بال بچے، غرض ہر فرد نے اس میں حصہ لیا۔ اور جن قربانیوں کے پاک خون سے زمین کی آغوش اب تک خالی تھی ان سے کربلا کا میدان رنگ گیا۔

پس حضرت حسین علیہ السلام کا واقعہ کوئی شخصی واقعہ نہیں ہے

اس کا تعلق صرف اسلام ہی کی تاریخ سے نہیں۔ بلکہ اسلام کی اصل حقیقت سے ہے۔ یعنی وہ حقیقت جس کا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ذات سے ظہور ہوا تھا۔ اور وہ بتدریج ترقی کرتی ہوئی حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی ذات تک پہونچ کر گم ہو گئی تھی۔ اس کو حضرت حسین علیہ السلام نے اپنی سرفروشی سے مکمل کر دیا۔

خاندان نبوت دنیا کے آباد کرنے کے لئے ہمیشہ اجڑتا رہا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت کی۔ حضرت موسےٰ علیہ السلام نے گھر بار چھوڑا۔ حضرت عیسےٰ علیہ السلام نے آوارہ گردی کی، اور نبوت محمدی کے متبعین میں سے حضرت حسین علیہ السلام نے میدان کربلا کے اندر اس خانہ ویرانی کو مکمل کر دیا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام سے خاندان نبوت کا سلسلہ ملا ہوا ہے۔ انھوں نے ایک وادی غیر ذی زرع میں شدت تشنگی سے ایڑیاں رگڑی تھیں۔ حضرت حسین علیہ السلام نے بھی میدان کربلا میں اس خاندانی روش کو زندہ کیا۔ اور غالباً یہی مقصود ہے ان مفسرین امامیہ کا جو "وفدینا بذبح عظیم" کی تفسیر میں ذبح عظیم شہادت امام علیہ السلام کو قرار دیتے ہیں۔ اور اس بارے میں بعض ائمہ اہلبیت کرام علیہ السلام کے آثار نقل کرتے ہیں۔

از:-

مولانا ابوالکلام آزاد

اُسوۂ حسین علیہ السلام

آیئے! سب سے پہلے آج ایک بھولی ہوئی صحبت ماتم کو پھر تازہ کریں۔ کتنے دن گذر گئے کہ راہ و رسم ماتم و شیون سے نا آشنا ہیں۔ نہ صدائے ماتم کی فغاں سنجی ہے۔ اور نہ چشم خونبار کی اشک فشانی۔ کاروبار غم کی رونق افسردہ ہو چلی ہے۔ اور روز بازار درد کی چہل پہل مدت سے موقوف ہے۔

نہ داغ تازہ می خارد، نہ زخم کہنہ می کارد
بدہ یارب دلے کیں صورت بیجا نمی خواہم

حادثہ درد و الم

طرابلس خون آلود، بلغارستان کو اگر لوگوں نے بھلا دیا۔ مشہد مقدس تبریز کا قصۂ غم اگر ذہنوں سے محو ہو گیا۔ مقدونیا اور البانیہ کے افسانہ ہائے خونین اگر فکروں سے فراموش ہو گئے۔ تو کچھ مضائقہ نہیں ارباب درد و الم کے لئے ایک ایسی داستان الم صدیوں سے موجود ہے۔ جو کبھی

بھلائی نہیں جاسکتی۔ اور اگر لوگ اسے بھی بھلا دیں۔ تو بھی ہر سال چند ایسے ماتم آلود دن تازگی زخم کہن کے لئے آموجود ہوتے ہیں جو از سرِ نو ایک ہزار تین سو برس پیشتر کے ایک حادثۂ عظیمہ کی یاد سے پھر تازہ کر دیتے ہیں۔

پس میرا اشارہ حادثہ ہائے کبرے یعنی شہادت حضرت سید الشہدا علیہ واعلیٰ اجدادہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف ہے

عظم اللہ اجورنا بمصا ئبنا!

وقتست کہ در پیچ د خم نوحہ سرائی
سوزِ نفس نوحہ گر از تلخ نوائی!
وقتست کہ آن پردگیاں کز رہِ تعظیم
بر درگہ شاں کردہ فلک ناصیہ سائی
از خیمۂ آتش زدہ عریاں بدر آیند
چوں شعلہ دخاں بر سرِ شاں کردہ ردائی
جانہا ہمہ فرسودہ تشنیعِ اسیری
دلہا ہمہ خوں گشتہ اندوہ رہائی
تنہاست حسین ابن علی در صفِ اعدا
اکبر تو کجا رفتی و عباس کجائی۔

پتہ یہ ہے کہ جن مردہ دلوں کو زندگی کے لئے سوزو تپش کی ضرورت ہو۔ جن ارباب درد کو روح کی راحت کے لئے جسم کے

ماتم کی تلاش ہو۔ جن کی زبانیں آہ و فغاں کو خوب اور جن کی آنکھیں خونبانہ فشانی کو اپنا مطلوب و مقصود سمجھتی ہوں۔ ان کی صحبت ماتم والم کی رونق کے لئے یہی افسانہ اتنا کچھ سامان غم اپنے اندر رکھتا ہے کہ اگر خون کے بڑے بڑے سیلاب سمندروں کی روانی سے بہہ جائیں۔ اور بیشمار لاشوں کی تڑپ سے زمین کے بڑے بڑے قطعات یکسر جنبش میں آ جائیں۔ جب بھی ان کی نذر، حال اس الہام سرائی سے قاصر رہے گی۔ جو اس کے ایک ایک لفظ کے اندر سے توصیہ فرمائے عبرت و بصیرت ہے۔

لیکن آہ! کتنے دل ہیں جنھوں نے اس واقعہ کو اس کے حقیقی بصائر و معارف کے اندر دیکھا ہے۔ اور کتنی آنکھیں ہیں۔ جو حسین ابن علی شہید پر گریہ و بکا کرتے ہوئے اس اسوۂ حسنہ کو بھی سامنے رکھتے ہیں۔ جو اس حادثۂ عظمیٰ کے اندر موجود ہے۔

فی الحقیقت یہ حق و صداقت، آزادی و حریت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک عظیم الشان انسانی قربانی تھی۔ جو صرف اس لئے ہوئی۔ تاکہ پیروان اسلام کے لئے ایک اسوۂ حسنہ پیش کرے اور اس طرح جہاد حق و عدالت اور اس کے ثبات و استقامت کی ہمیشہ کے لئے ایک کامل ترین مثال قائم کر دے۔ پس جو بے خبر ہیں ان کو رونا چاہیئے ان السمع متکو (فتیاکوا) اور جو رو تے ہیں۔ ان کو صرف رونے پر ہی اکتفا نہ کرنا چاہیئے۔ ان کے سامنے سید الشہدا

نے اپنی قربانی کا ایک اسوۂ حسنہ پیش کر دیا ہے۔ اور کسی روح کے لئے ہرگز جائز نہیں کہ محبت حسین کی مدعی ہو۔ جب تک کہ اسوۂ حسینی کی متابعت کا اپنے اعمال کے اندر سے ثبوت نہ دے۔

اسوۂ حسینی ضرورت ہے کہ تفصیل کے ساتھ اس حادثہ ہائے شہادت پر نظر ڈالی جائے۔ سب سے پہلے اس کی تاریخی حیثیت نمایاں کر کے ان تمام مواعظ و نتائج عظیمہ کو ایک ایک کر کے بیان کیا جائے۔ جو اس ذبح عظیم کے اندر پوشیدہ ہیں۔ اور جن کی لسان حیات آج بھی اسی طرح صدا دے رہی ہے۔ جس طرح کنار فرات کی ریتیلی سرزمین پر ایسے بارہ سو برس پہلے زخم و خون کے اندر سے وعظ فرمائے حقیقت و صداقت تھی۔

دنیا میں ہر چیز مرجاتی ہے کہ فانی ہے۔ مگر خون شہادت کے ان قطروں کے لئے جو اپنے اندر حیات الٰہیہ کی روح رکھتے ہیں کبھی بھی فنا نہیں۔

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگرست

یہاں صرف چند مجمل اشارات پر اکتفا کروں گا

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

(۱) سب سے پہلا نمونہ جو یہ حادثہ عظیمہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ دعوت الی الحق، اور حق و حریت کی راہ میں اپنے تئیں قربان

کرنا ہے۔

بنی امیہ کی حکومت ایک غیر شرعی حکومت تھی۔ کوئی حکومت جس کی بنیاد جبر و شخصیت پر ہو، کبھی بھی اسلامی حکومت نہیں ہو سکتی انھوں نے اسلام کی روح حریت و جمہوریت کو غارت کیا۔ اور مشورہ و اجماع امت کی جگہ محض غلبہ جابرانہ اور مکر و خدع پر اپنی شخصی حکومت کی بنیاد رکھی۔ ان کا نظام حکومت شریعت الٰہیہ نہ تھا۔ بلکہ محض اغراض نفسانیہ و مقاصد سیاسیہ، ایسی حالت میں ضرور تھا کہ ظلم و جبر کے مقابلہ کی ایک مثال قائم کی جاتی۔ اور حق و حریت کی راہ میں جہاد کیا جاتا۔ حضرت سید الشہداء نے اپنی قربانی کی مثال قائم کر کے مظالم بنی امیہ کے خلاف جہاد حق کی بنیاد رکھی" اور جس حکومت کی بنیاد ظلم و جبر پر تھی۔ اس کی اطاعت و وفاداری سے انکار کر دیا۔

پس یہ نمونہ تعلیم دیتا ہے کہ ہر ظالمانہ و جابرانہ حکومت کا علانیہ مقابلہ کرو اور کسی ایسی حکومت سے اطاعت و وفاداری کی بیعت نہ کرو۔ جو خدا کی بخشی ہوئی انسانی حریت و حقوق کی غارت گر ہو، اور جس کے احکام مستبدہ و جابرہ کی بنیاد صداقت و عدالت کی جگہ جبر و ظلم پر ہو۔

(۲) مقابلہ کے لیے یہ ضرور نہیں کہ تمہارے پاس قوت و شوکت مادی کا وہ تمام ساز و سامان بھی موجود ہو جو ظالموں کے پاس ہے کیونکہ حسین ابن علیؑ کے ساتھ چند ضعفاء و مساکین کی جمعیت قلیلہ تھی

در کچھ نہ تھا۔ حق و صداقت کی راہ نتائج کے فکر سے بے پروا ہے۔ نتائج کا مرتب کرنا تمہارا کام نہیں۔ یہ اس قوت قاہرۂ عادلہ الٰہیہ کا کام ہے۔ جو حق کو باوجود ضعف و فقدان انصار کے کامیاب و فتحمند کرتی۔ اور ظلم کو باوجود جمیعت عظمت دنیوی کے نامراد و نگونسار کرتی ہے۔ وکم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ۔

ایسے موقعوں پر ہمیشہ مصلحت اندیشیوں کا خیال دامنگیر ہوتا ہے۔ جو فی نفسہ اگرچہ عقل و دانائی کا ایک فرشتہ ہے۔ لیکن کبھی کبھی شیطان رجیم بھی اس کے بھیس میں آکر کام کرنے لگتا ہے نفس دخادع حیلہ تراشیاں کرتا ہے کہ صرف اپنے تئیں کٹوا دینے اور چند انسانوں کا خون بہا دینے سے کیا حاصل؟ توپ و تفنگ اور تخت و سلطنت کا مقابلہ کس نے کیا ہے کہ ہم کریں۔

آخری سوال کا جواب میں دے سکتا ہوں۔ تاریخ عالم کی صدہا امثال متقدمہ و متاخرہ جہاد سے قطع نظر تمہارے سامنے خود مظلوم کربلا کی مثال موجود ہے۔ تم کہتے ہو کہ چند انسانوں نے حکومتوں کی قوتوں اور ساز و سامان کا مقابلہ کب کیا ہے۔ کہ کبھی بھی کیا جائے میں کہتا ہوں حسین بن علی نے صرف بہتر (۷۲) بھوکے پیاسے انسانوں کے ساتھ اس عظیم الشان حکومت قاہرۂ جابر کا مقابلہ کیا جس کے حدود سلطنت ملتان سے سرحد فرانس تک پھیلے ہوئے تھے۔

اور گو یہ سچ ہے کہ اس نے آنکھوں کے سامنے اپنے دل کے ٹکڑوں کو بھوک اور پیاس کی شدت سے تڑپتے دیکھا۔ اور پھر ایک ایک کرکے ان میں سے ہر وجود مقدس خاک و خون میں تڑپا۔ اور جاں بحق تسلیم ہوا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ دشمنوں سے پینے کے لئے نہ تو پانی چھین سکا۔ اور نہ زندہ رہنے کے لئے اپنی غذا حاصل کر سکا اس میں بھی شک نہیں کہ بالآخر سر سے لے کر پیر تک وہ زخموں سے چور ہوا۔ اور اس خلعت شہادت لالہ گوں سے آراستہ ہوکر تیار ہوا تاکہ اس کرشمہ ساز عجائب کے حریم وصال میں پہنچے۔ جو دوستوں کو خاک و خون میں تڑپاتا اور دشمنوں کو مہلت دیتا ہے۔

اریدو صالہ ویرید قتلی

تاہم فتح اس کی تھی اور فیروزمندی و کامرانی کا تاج صرف اسی کے زخم خوردہ سر پر رکھا جا چکا تھا۔ وہ تڑپا اور خاک و خون میں لوٹتا پر اپنے اس خون کے ایک ایک قطرہ سے جو عالم اضطراب میں اس کے زخموں سے ریگ و سنگ پر بہتا تھا۔ انقلاب و تغیرات کے وہ سیلاب ہائے آتشیں پیدا کر دیئے۔ جن کو نہ تو مسلم بن عقبہ کی خون آشامی روک سکی۔ نہ حجاج کی بے اماں خونخواری اور عبدالملک کی تدبیر سیاست۔ وہ بڑھتے اور بھڑکتے ہی رہے۔ ظلم و جبر کا پانی تیل بن کر ان کے شعلوں کی پرورش کرتا رہا۔ اور حکومت و تسلط کا غرور ہوا بن کر ان کی ایک چنگاری کو آتشکدۂ سوزاں بناتا رہا۔ یہاں تک کہ آخری

وقت آگیا۔ اور جو کچھ ۶۱ھ میں کربلا کے اندر ہوا تھا وہ سب کچھ ۱۳۲ھ
میں نہ صرف دمشق بلکہ تمام عالم اسلامی کے اندر ہوا۔ صاحبان تاج و تخت
خاک و خون میں تڑپے۔ ان کی لاشیں گھوڑوں کے سموں سے پامال کی
گئیں۔ فتحمندوں نے قبریں تک اکھاڑ ڈالیں اور مردوں کی ہڈیوں تک کو
ذلت و حقارت سے محفوظ نہ چھوڑا۔ اور اس طرح وسیعلم الذین ظلمو
ای منقلب ینقلبون :- کا پورا پورا ظہور ہوا۔

کیا یہ سب کچھ جو ہوا وہ محض ابراہیم عباسی کی دعوت اور ابو مسلم
خراسانی کی خفیہ ریشہ دوانیوں ہی کا نتیجہ تھا۔ کیا یہ اسی خون کا اعجاز
نہ تھا۔ جو فرات کے کنارے بہایا گیا تھا۔ پھر یہ فتح مندی تو ظاہر
ہے۔ جس کے نتائج کے لئے ایک صدی کا انتظار کرنا پڑا۔ در اصل
فی الحقیقت مظلومیت کا خون جس وقت بہتا ہے۔ اسی وقت اپنی مخصوص
فتح مندی حاصل کر لیتا ہے۔

(۱۲) بہر حال یہ تو حق و صداقت کی قربانیوں کے نتائج ہیں۔ جو
کبھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ لیکن حضرت سید الشہداء کا اسوۂ
حسنہ بتلاتا ہے کہ تم ان نتائج کی ذرا بھی پرواہ نہ کرو۔ اگر ظلم و جابرانہ
حکومت کا وجود ہے تو اس کے لئے حق کی قربانی ناگزیر ہے۔ اور اسے
ہونا ہی چاہیئے۔ تعداد کی قلت و کثرت یا سامان و وسائل کا فقدان
اس پر موثر نہیں ہو سکتا۔ اور ظلم کا صاحب شوکت و عظمت ہونا
اس کے لئے کوئی الٰہی سند نہیں ہے کہ اس کی اطاعت ہی کر لی جائے

ظالم خواہ ضعیف ہو خواہ قوی، ہر حال میں اس کا مقابلہ کرنا چاہیئے کیوں وہ ظلم ہے اور حق و صداقت ہر حال میں یکساں اور غیر متزلزل ہے!

(۳) حق و صداقت کی رفاقت کی آزمائشیں زہرہ گداز اور شکیب ربا ہیں۔ قدم قدم پر حفظ جان و ناموس اور محبت فرزند و عیال کے کانٹے دامن کھینچتے ہیں۔ لیکن یہ اسوۂ حسنہ مومنین و مخلصین کو درس دیتا ہے۔ کہ اس راہ میں قدم رکھنے سے پہلے اپنی طلب و ہمت کو اچھی طرح آزمالیں۔ نہ کہ چند قدموں کے بعد ہی ٹھوکر لگے

جرم بر این جا عقوبت ہست و استغفار نیست

اس قتیل جادۂ حق و صداقت کے چاروں طرف جو کچھ تھا۔ اس کا اعادہ ضروری نہیں کہ سب کو معلوم ہے۔ خدا تعالے نے اپنی آزمائشوں کے متعدد درجے بیان کیے ہیں۔

ولنبلونکم بشیٔ من	اللہ تعالیٰ تمہیں آزمائشوں میں ڈالے گا
الخوف والجوع ونقص	وہ حالت خوف وہراس، بھوک اور
من الاموال والانفس	پیاس، نقصان جان و مال اور ہلاکت
والثمرات۔ وبشر	اولاد و اقارب میں مبتلا کرکے تمہارے
الصابرین الذین اذا	صبر و استقامت کو آزمائے گا۔ پس اللہ
اصابتھم مصیبۃ	کی طرف سے بشارت ہے ان کے لیے
قالوا انا للہ وانا	جن کے ثبات و استقامت کا یہ حال ہے

الیہ راجعون (۲ ۱۵۲ ۲۸) کہ جب مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ تو اپنے تمام معاملات کو یہ کہکر اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں کہ انا للہ وانا الیہ راجعون!)

خوف وہراس، بھوک اور پیاس نقصان اموال ومتاع قتل نفس اور اولاد یہی چیزیں انسان کے لئے اس دنیا میں انتہائی مصیبتیں ہو سکتی ہیں۔ اس لئے انہی چیزوں کو راہ الٰہی کے لئے آزمائش قرار دیا گیا۔

لیکن مظلوم کربلا کے سامنے یہ تمام مرحلے ایک ایک کرکے موجود تھے۔ وہ ان تمام مصائب سے ایک لمحہ کے اندر نجات پاکر آرام وراحت اور شوکت وعظمت حاصل کر سکتا تھا۔ اگر حکومت ظالمانہ کی وفاداری واطاعت کا عہد کر لیتا۔ اور حق وصداقت سے روگردانی کے لئے مصلحت وقت کی تاویل پر عمل کرتا۔ پر اس نے خدا کی مرضی کو اپنے نفس کی مرضی پر ترجیح دی، اور حق کا عشق زندگی اور زندگی کی محبتوں پر غالب آگیا۔ اس نے اپنا سر دیدیا کہ انسان کے پاس حق کے لئے یہی ایک آخری متاع ہے۔ پر اطاعت واقرار وفاداری کا ہاتھ نہ! جو صرف حق وعدالت ہی کے آگے بڑھ سکتا تھا۔ ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ واللہ رؤف بالعباد!

(۵) سب سے بڑا اسوۂ حسنہ کہ اس حادثہ عظیمہ کی لسان حال اس کی ترجمانی کرتی ہے۔ راہ مصائب وجہاد حق میں صبر واستقامت اور عزم وثبات ہے کہ ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا

دوسری جگہ کہا۔ فاستقم کما امرت! وللہ در ما قال

رو ید کشادہ باید پیشانی فرخ
آنجا کہ لطمہ ہائے ید اللہ می زنند

فی الحقیقت اس شہادت عظمیٰ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اپنے تمام عزیز و اقارب اہل و عیال اور فرزند و احباب کے ساتھ دشت و غربت و مصائب میں محصور اعدا ہونا اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے جگر گوشوں کو شدت عطش و جوع سے آہ و فغاں کرتے ہوئے دیکھنا۔ پھر ان میں سے ایک ایک کی خون آلود لاش کو اپنے ہاتھوں سے اٹھانا۔ حتےٰ کہ اپنے طفل شیر خوار کو بھی تیر ظلم و بربریت سے نخچیر پاتا۔ مگر بایں ہمہ راہ شق و صداقت میں جو پیمان صبر و استقامت باندھا تھا۔ اس کا ایک لمحہ بلکہ ایک عشر و تیقہ کے لئے بھی متزلزل نہ ہونا۔ اور حق کی راہ میں جس قدر مصائب و اندوہ پیش آئے۔ سب کو شکر و منت کے ساتھ برداشت کرنا کہ رضینا بقضا اللہ و صبرنا علی بلائہ

پیکان تیر بجاں خریدار
من مرہم دیگراں نخواہم

دوست کے ہاتھ سے جام زہر بھی ملتا ہے۔ تو تشنہ کامان زلال محبت اسے غیروں کے جام شہد و شکر پر ترجیح دیتے ہیں

لے جفا ہائے تو خوشتر ز وفائے دگراں

آج بھی اگر کوئی حقیقت نیوش باز ہو۔ تو خاک کربلا کا ایک ایک ذرہ توصیہ فرمائے صبر و استقامت ہے۔

شد ہم خاک ولیکن بہ بوئے تربت ما
تواں شناخت کزیں خاک مرد می خیزد

اگر اس صبر و استقامت کے اسوۂ حسنہ کو دیکھنا چاہتے ہو۔ تو خدارا تاریخ کی طرف توجہ کرو۔ صرف ایک روایت یہاں لکھوں گا۔ تاکہ جو لوگ خاندان نبوت اور عترۃ حضرت رسالت کی محبت کا دعوے کرتے ہیں وہ غور کریں کہ ادعاء محبت بغیر متابعـ[illegible] بیکار ہے۔

حضرت امام علی بن حسین زین العابدین علیہ الس[illegible] ہتے ہیں۔

جس رات کو میدان شہادت گرم ہونے والا تھا۔ یہ اسی شب کا واقعہ ہے کہ میں بیمار پڑا تھا۔ میری پھوپی زینب میری تیمارداری میں مصروف تھیں۔ اتنے میں حضرت امام حسین داخل ہوئے۔ وہ چند اشعار پڑھ رہے تھے۔ جنہیں سن کر میں سمجھ گیا کہ ان کا ارادہ کیا ہے؟ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ ہم پر ابتلاء الٰہی نازل ہو گئی ہے۔ اور اب اس سے چارہ نہیں۔ مگر حضرت زینبؓ ضبط نہ کر سکیں۔ کیونکہ قدرتی طور پر عورتیں زیادہ رقیق القلب ہوتی ہیں۔ وہ ماتم کناں چلا اٹھیں۔ واحسرتا وا مصیبتا! الیوم ماتت فاطمہ وعلی والحسن بن علی۔

لیکن جب حضرت حسینؓ نے یہ حالت دیکھی۔ تو ان کی جانب متوجہ ہوئے اور کہا کہ اے بہن! یہ کیا بے صبری اور کیسا جزع و فزع ہے۔ اللہ سے ڈرو کہ موت یقیناً ایک آنیوالی چیز ہے۔ اور اس سے کوئی

پہنچ نہیں سکتا۔

لیکن حضرت زینب شدت غم و حزن سے مضطر تھیں۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ آنے والی صبح کن واقعات خونین کے ساتھ طلوع ہوگی۔ فرط غم میں انھوں نے اپنا چہرہ پیٹ لیا۔ گریبان پھاڑ ڈالا۔ اور واویلا وا حسرتا پکارتی ہوئی بیہوش اپنے بھائی پر گر پڑیں۔ حضرت حسین نے یہ حالت دیکھکر ان کے منہ پر پانی ڈالا اور جب ہوش میں آئیں تو فرمایا۔

اے بہن یہ کیسا غم و حزن ہے جو تم کر رہی ہو۔ تمہیں چاہیئے کہ اللہ کے حکم و فرمان کے مطابق جو طریق عزا و حزن ہے اسے اختیار کرو۔ کیونکہ میرے لیئے اور ہر ایک مسلم کے لیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور انکے اعمال و افعال میں اتباع و پیروی کے لیئے بہترین نمونہ ہے!

اللہ اکبر! خاندان نبوت کے اس مرتبہ رفیع اور اس درجہ عظیم کو دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ کس طرح ان کے سامنے تھا۔ اور "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" کے حکم کے آگے کس طرح انھوں نے اپنے جذبات اور خواہشوں کو قربان کر دیا تھا۔

ایسے سخت گیر اور زہرہ گداز موقعہ پر بھی اپنی بہن کا جزع و فزع انھیں گوارا نہ ہوا۔ اور بجائے عام الفاظ صبر و تشفی کہنے کے فرمایا تو یہ فرمایا کہ فان لی ولکل مسلم اسوۃ فی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

پھر آج کتنے مدعیان محبت اہل بیت کرام ہیں۔ جو اس اسوۂ حسنہ کے اتباع کا اپنے اعمال سے ثبوت دے سکتے ہیں؟

از:-

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

شیخ الجامعہ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر دہلی

تمہید ہندوستان کی سرزمین پر جہاں ہر مذہب و ملت کے اہل دل ہمیشہ سے کثرت میں وحدت دیکھتے اور دکھاتے رہے ہیں۔ یہ بات کہنے کے لئے کسی دلیل اور بحث کی ضرورت نہیں ہے کہ حق کا نور ایک ہے۔ مگر دیکھنے والے ان میں جیسی اور جتنی دیدار کی طاقت ہے اس کا جلوہ اپنے اپنے رنگ میں دیکھتے ہیں اور اس کی کیفیت اپنی اپنی زبان میں بیان کرتے ہیں۔ جب کوئی بات اس طرح کہنی ہو کہ ہر مذہب و ملت کے لوگ اسے سمجھ سکیں۔ اور اس سے اپنے اپنے دل پر ٹھیک اثر لے سکیں۔ تو ملتوں اور مذہبوں کی جدا جدا بولیوں اور الگ الگ مخصوص اصطلاحوں کو چھوڑ کر اسے انسانیت کی عام [illegible] ن میں کہنا پڑتا ہے۔ شہادت حسین کے موضوع پر کچھ لکھنے اور لکھا [illegible] مقصد جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہی ہے کہ فخر انسانیت کے اور مایۂ ناز بشریت حسین کے کارناموں کی قدر و قیمت کو انسانیت کے عام معیاروں پر رکھا جائے۔ اور اس کا نتیجہ انسانیت کی عام زبان میں

بیان کیا جائے۔ سب جانتے ہیں کہ ایک محاورے کو دوسرے محاورے
میں ترجمہ کرنا کٹھن ہے۔ اور جب اس کے ساتھ یہ شرط ہو کہ ترجمے
کی زبان وہ ہو جو انسانوں کے دل کی زبان ہے۔ تو یہ کام اور بھی کٹھن
ہو جاتا ہے۔ ایک مسلمان کے لئے جو حضرت امام حسینؑ کا حال مذہبی رنگ
میں سننے اور سنانے کا عادی ہے۔ اسے اس نئے رنگ میں اس طرح
بیان کرنا کہ اس ذکر سے جو کیفیت اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ وہی
دوسروں کے دل میں پیدا ہو جائے۔ بہت مشکل ہے۔ مگر یہ بات ہمت
بندھاتی ہے کہ جب سننے والوں کے دل ہمدردی اور محبت
سے سمجھنے پر آمادہ ہوں۔ تو وہ ادھ کہی بات بلکہ ان کہی بات بھی
سمجھ لیتے ہیں۔

ایسے یہاں یہ سوال
یہ پیدا ہوتا ہے کہ

واقعہ شہادت اور عالم انسانیت

اس عالم انسانیت کے لئے حسینؑ کی شہادت کیا تخت طلبی کی
بس ایک ناکام کوشش ہے۔ جس میں آپ کو ناکام فریق سے ایک
تاریخی ہمدردی سی ہے؟ یا یہ محض ایک مغرور المزاج سردار کی ضد یا
ناعاقبت اندیشی ہے۔ جس میں ضد کرنے والا اتفاق سے آپ کے
محبوب اور مخدوم آقا کا جگر گوشہ ہے۔ اس لئے آپ اس کی پچ
کرتے ہیں۔ کیا یہ بیدردی اور سفاکی سے ایک کمزور جماعت کے مٹائے
کی دل ہلانے والی کہانی ہے۔ جس کو سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

اور آنسوؤں کی چند بوندیں آنکھوں سے بے اختیار ٹپک جاتی ہیں؟ دنیا کی تاریخ میں ہمدردیوں اور طرف داریوں کے لیے اور مواقع ہیں۔ اور وہ شخصی اور جماعتی ناکامیوں اور نامرادیوں بیدردیوں اور سفاکیوں کی کہانیوں سے اتنی پر ہے کہ صرف ان کے لئے تو دنیا کو حسینؑ کی داستان کی خاص ضرورت نہیں۔ لیکن پھر حسین کی کہانی ان میں سے کوئی چیز نہیں۔ وہ تو انسانی سرفرازی اور سربلندی کی داستان ہے، شرف انسانیت کی کہانی ہے انسان کی پستی سے بلندی کی طرف ارتقا کی روداد ہے۔ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے معیاروں کی تفسیر ہے۔ یہی غلامی سے انسانی حریت کی طرف سفر کی منزل ہے۔ وہ دنیا میں خدائی بادشاہت کا اعلان ہے۔ اور انسانوں میں اس کے قیام کے امکان بلکہ لزوم پر کسی جرح سے نہ ٹوٹنے والی شہادت ہے۔ وہ منزل تکمیل انسانی کی راہ چراغ ہے۔ اس چراغ کو باطل کی قوتیں جب کبھی اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہتی ہیں۔ تو حسین کی یاد اس کی لو کو روشن کر دیتی ہے۔ جب راہِ حق و حریت میں انسانیت کے قدم ڈگمگاتے ہیں۔ تو حسینؑ کی مثال اسے سہارا دیتی ہے اور سنبھال لیتی ہے۔ جب دولت و قوت و اقتدار کی فرعونیت حق پرستوں کی تہی دست اور بے وسیلہ جمعیتوں پر عرصۂ زندگی تنگ کرتی ہے۔ اور جب پیہم ناکامیوں کا ہجوم حق پر باطل ہونے

وسوسے دل میں ڈالتا ہے۔ تو حسین کی مثال ہی انھیں ثبات
ہی کا سبق دیتی ہے۔ اور یاس کی کفر آفرینی سے بچاتی ہے، جب
اجتماعی زندگی کا فساد فرد کو بے حقیقت سا بنا دیتا ہے۔ تو حسینؑ کی
مثال اس فرد کو اس کی ذمہ داری یاد دلاتی ہے۔ کہ جماعت کو اخلاقی
جماعت بنانے کا فرض آخری طور پر اسی پر عاید ہوتا ہے۔ چاہے
اس کوشش میں جماعت اسے زہر کا پیالہ پلائے ۔ یا
سولی پر چڑھائے۔ سنگسار کرے یا سر تن سے جدا کرکے شہادت
کے خون سے زمین کو لالہ زار بنائے۔ زندگی کے حشر میں انسانوں
کو حسین یاد دلاتے ہیں کہ زندگی ہر حال میں جیے جانے کا نام نہیں
ہے اور جتلاتے ہیں۔ کہ

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

جب کامیابی کے طلائی بچھڑے کی پرستش ہر سو ہو رہی ہو تو حسینؑ
ناکام کا نام ہی اس سحر سامری کا توڑ بن جاتا ہے۔ اور حسینؑ کی ناکامی کے
روبرو باطل کی ساری فتحمندیاں سرنگوں دشرمسار نظر آتی ہیں

لیکن آخر یہ سب کیوں؟

حسینی عظمت اور اس کا راز

اس لئے کہ حسین نے اپنی
جان دیکر خدا کی خدائی اور انسان کی شرافت پر شہادت دی ہے
اور اس دستاویز پر اپنی خون سے مہر ثبت کی ہے۔ یہ انسانی
شرافت کیا ہے؟ بہائم پر انسان کو کون سی چیز برتری کا مرتبہ دیتا ہے

اس کے سینے میں ہیں قانون و اخلاق کا وجدان " یہ جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں ؟" اس کے دل میں اعلےٰ اقدار کا ذوق و شوق ادنےٰ سے اعلیٰ کی طرف لے جانے کا قصد! اعلےٰ کو جان کر ادنےٰ پر قناعت سے اس کی فطری بیزاری، پھر ان اقدار اعلیٰ کا مطلق اور کامل حیثیت میں یقین اور اس پر اس کے قلب و ضمیر کی تصدیق یہی صفات اخلاقی کے وہ مکمل نمونے ہیں۔ جن پر ہر چیز کی قدر و قیمت پرکھی جاتی ہے۔ مثلاً عدل، حق، خیر، حسن۔ انھیں سے اس کی شب تار حیات میں روشنی کی جھلک ہے۔ انہی سے اس کی بے چینی میں سکون اور پراگندگی میں دل جمعی کا سامان ہے۔ وہ بھٹکتا ہے تو یہی دلیل راہ ہوتی ہے۔ زندگی کے دوراہے پر جب یہ کفر کی طرف جاتا ہے۔ تو یہی اسے شکر کی طرف کھینچتی ہیں۔

اسفل السافلین میں بھی احسن تقویم یاد دلاتی ہے۔ انھیں بھلایا جاتا ہے۔ مگر یہ پھر بار بار یاد آتی ہے۔ انھیں دبایا جاتا ہے مگر یہ پھر ابھرتی ہیں۔ ان سے بدکنے والے وحشی بھی گھوم پھر کے ان کو جاتے ہیں تکتے۔" یہ اقدار مطلقہ حواس ظاہری سے محسوس نہیں ہو سکتیں۔ ان کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ چشم ظاہر ان کے نظارے سے محروم ہے۔ صرف چشم باطن ہی کو ان کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہر ملک میں خدا کے ایسے بندے پیدا ہوتے ہیں۔ جو ان اقدار کو بے حجاب اس طرح دیکھتے ہیں، جیسے ہم

چاند، سورج، ستاروں کو دیکھتے ہیں۔ اور ان کے نور سے وہ دنیا کی ہر چیز کو، زندگی کے ہر شعبے کو، انفرادی ہو کہ اجتماعی منور کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے قول سے ان اعلیٰ قدروں کی تلقین کرتے ہیں اپنے عمل سے ان کی تصدیق کرتے ہیں۔ انھیں اپنے پر طاری کرتے ہیں، اپنے اندر چلاتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی زندگی کی روشنی سے دوسروں کی نظریں ان تک پہونچاتے ہیں۔ اور دوسروں کے دل ان کی طرف جھکاتے ہیں۔ اور جب انسان کی بہیمیت ان پر نرغہ کرتی ہے۔ تو ان کی حفاظت کے لئے کمربستہ ہو جاتے ہیں حفاظت میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کا اصلی رنگ ناکامی میں نکھرتا ہے۔ ان کی ظاہری کامیابی سے ان کی پیش کردہ اقدار پر یقین اتنا راسخ نہیں ہوتا۔ جتنا اس وقت ہوتا ہے، جب باطل کی یلغار اتنی شدید ہوتی ہے۔ کہ کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ شکست یقینی ہوتی ہے۔ اور یہ ناکامی اور شکست کے یقینی ہونے کے باوجود اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کے ساتھی نہیں بنتے۔ اس پر گالیاں کھاتے ہیں ــــ ذلتیں سہتے ہیں۔ تکلیفیں اٹھاتے ہیں۔ اور اگر یہ "مرتبہ بلند" نصیب ہیں ہوتا ہے۔ تو آخر کار جان کی نذر پیش کر کے اپنی سچائی کا آخری ثبوت دے دیتے ہیں۔ اور انسانیت کو جتا دیتے ہیں کہ کامیابی اور اقتدار کی لاگ سے وہ کہیں یہ نہ سمجھ لے کہ ان اقدار مطلقہ کی

سیوا بس اسی وقت تک ہے۔ جب تک فتح مندیاں ہیں۔ نہیں ان کے ساتھ رہ کر ناکامیاں دوسروں کے ساتھ کی کامیابیوں سے اعلیٰ کی خاطر بدنامیاں۔ اوروں کے ساتھ کی نیک نامیوں سے بہتر ہیں۔ ان کی جلو کی رسوائیاں بڑی بڑی کامرانیوں سے زیادہ وقیع اور ان کی سنگت کی تنہائیاں۔ لشکروں اور جیشیوں پر قابل ترجیح ہیں حسین انھیں اقدار مطلقہ کے علمبردار تھے۔ انھیں کے لئے جیے، انھیں کے لئے لڑے۔ اور انھیں پر اپنی جان نثار کردی۔ اور اپنی زندگی اور اپنی موت دونوں سے انسانیت کے لئے ایک دائمی شمع ہدایت روشن فرما گئے۔ اس شمع کی روشنی زندگی کے ہر شعبے میں راہ نما ہے۔ لیکن جماعتی زندگی کی گمراہیوں میں اس شمع سے اکتساب نور کی طرف خاص طور پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

امتیاز حق و باطل انسان کا فرض ہے

اسلام کے نزدیک دین کی بناء اقدار کی وحدت پر ہے۔ بنیادی اقدار حکم اور حکمت اور حق ہیں حکمت اور حق بنیادی اقدار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ میں صرف حکم کی تشریح کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے مراد ہے حکومت۔ اقتدار اعلیٰ ذرا سوچئے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نوع انسانی کی اچھی سیاسی تشکیل عدل اور انصاف پر مبنی حکومت کا قیام انسان کی اخلاقی زندگی کے لئے ناگزیر ہے۔ اس لئے اچھی حکومت بھی ایک اخلاقی

قدر رکھتی ہے۔ اور اس کا ایک مکمل نمونہ ہماری ہدایت کے لئے ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ جتنا حکمت اور حق کا۔ اس کا نام حکم ہے۔ حکم، حکمت اور حق کو ایک ماننا اسلام کی تعلیم ہے۔ یعنی اسلام یہ کہتا ہے کہ حکم بھی اسی ذات کے لئے ہے۔ جو عین حق اور عین حکمت ہے۔ عبادت یعنی غیر مشروط اور غیر محدود اطاعت صرف اسی کی کرنی چاہیئے۔ اور کسی کی نہیں۔ شرطوں کے ساتھ اور حدوں کے اندر دوسرے کی اطاعت بھی کی جا سکتی ہے۔ مگر شرط اور حد یہی ہے کہ مجازی حکم، حقیقی حکم، اور حکمت اور حق کے خلاف نہ ہو۔ اگر دنیا میں حکم حقیقی قائم ہو۔ تو انسان کا کھلا ہوا فرض ہے کہ بغیر کسی شرط کے اس کی اطاعت کرے۔ لیکن اگر حکم مجازی کا دور دورہ ہے۔ تو اطاعت کے لئے شرطیں لگانی پڑتی ہیں جن میں سب سے پہلی چیز یہی ہے۔ کہ انسان کو کوئی کام اس حکم کے خلاف نہ کرنا پڑے۔ جسے وہ حکم حقیقی جانتا ہے۔ لیکن سب سے بڑی مشکل اس وقت پیش آتی ہے۔ جب حکم مجازی سراسر حکم حقیقی کے خلاف ہو۔ اور انسان کو اس کی خلاف ورزی پر مجبور کرتا ہو۔ اس سے بڑھ کر مشکل جس کے تصور تک سے حق پسند کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ یہ ہے کہ باطل کی حکومت یہ مطالبہ کرے کہ اسے حکم حقیقی سمجھا جائے۔ جب دنیا پر یہ مصیبت آئے۔ تو ہر آزادی کا فرض ہے کہ وہ قول سے فعل سے یہ اعلان کرے۔ کہ یہ باطل

کی حکومت سراسر حکم حقیقی کے خلاف ہے۔ میں اس کے آگے ہرگز
سر نہ جھکاؤں گا۔ اور کوئی اس کے آگے سر نہ جھکائے۔ اس
اعلان کا نام شہادت ہے۔ اس شہادت پر باطل کی قوتیں
ٹوٹ پڑتی ہیں۔ مگر اس کے سارے ظلم سہہ کر ہی مرد حق دوسروں
کو حق و باطل کا فرق دکھا سکتا ہے۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ
قدر اعلیٰ کو بے حجاب دیکھنے والے کم ہوتے ہیں، اب یہ مرد
حق جو حکم حقیقی کو بے حجاب دیکھ رہا ہے۔ دنیا کے کم نگاہوں
کو کس طرح دکھائے، سوا اس کے کہ اس راہ میں قربانیاں
کر کے اپنے عقیدے کی قوت سے دلوں کو پگھلائے۔ کبھی
کبھی اس راہ میں جان دے کر آخری قربانیاں دینی پڑتی
ہیں۔ جو شخص جان دے کر باطل کے مقابلے میں آخر دم
تک حق کا اعلان کرے، وہی شہادت کے سب سے اونچے
درجے پر فائز ہوتا ہے۔ اور عام طور پر شہید صرف اسی کو کہتے ہیں۔

باطل سے جنگ

اب آپ تاریخ کے صفحات کو پلٹ کر دیکھئے۔ اسلام کا ابتدائی زمانہ جسے
مسلمان سب سے زیادہ اچھا سمجھتے ہیں، گزر چکا ہے۔ حکم حقیقی یعنی
خلافت راشدہ کا دور ختم ہوتا ہے۔ حکم مجازی یعنی ملوکیت کا دور
آتا ہے۔ حکم حقیقی کے خلاف ملک کے محاصل، ذاتی ملک بنتے
ہیں، اور بادشاہ بہت بڑا خزانہ جمع کر کے دولت کے بل پر

پنی قوت بڑھاتا ہے۔ اور عالم اسلامی کو اپنی اطاعت پر مجبور
کرتا ہے، کچھ لوگ ڈر سے، کچھ لالچ سے سر جھکا دیتے ہیں بعض
سر ایسے ہیں جو نہیں جھکتے۔ انہی میں سے رسول کے نواسے حسینؑ کا
سر ہے، لالچ۔ دھمکی فریب سے کام لیا جاتا ہے۔ مگر حسینؑ یزید
کی اطاعت سے انکار کرتے ہیں۔ بھلا حسینؑ جن کی رگوں میں
علیؓ فاطمہؓ اور محمدؐ کا خون تھا۔ جن کے دل میں حق کا خوف
اور حق کا عشق تھا۔ حکم باطل کو حکم حق کیسے کہہ دیتے۔ حسین
نے بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ گویا یہ اعلان کر دیا کہ یزید کا
حکم حکم باطل ہے، یہ پہلی شہادت تھی۔

ان کو ان کا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ مکے میں بھی چین نصیب
نہ ہوا، ترک وطن کر کے عراق کا قصد کیا۔ یہ اس بات
کا اعلان تھا کہ مجھے یزید کے حکم کے باطل ہونے پر اس
درجہ یقین ہے اور اسے قبول کرنے سے اس شدت سے انکار
ہے کہ ترک وطن کی تکلیف اٹھانے کو تیار ہوں، یہ دوسری
شہادت تھی۔

کوفے کی راہ میں کربلا کے مقام پر یزید کے لشکر نے حسینؑ
کی راہ روک لی۔ اور ان کا چھوٹا سا لشکر گھر گیا۔ اب آخری قربانی
اور آخری امتحان کا سامنا تھا۔ حسینؑ نے آخری قربانی پیش کی، آخری
امتحان میں پورے اترے، ان کے ساتھیوں اور عزیزوں میں سے ایک

ایک مارا گیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے قتل ہو گئے۔ آخر خود حسینؑ زخموں سے چور چور زمین پر گر پڑے۔ مگر ان کے دل میں یہی تھا۔ ان کی زبان پر یہی تھا۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں حکم صرف اللہ کے لئے یہ تیسری اور آخری شہادت تھی۔

کہتے ہیں کہ جب لشکر شام والے حسین کے اہل بیت کو اسیر کرکے اور کربلا کے شہیدوں کے سر نیزے پر چڑھا کر لے چلے۔ تو راہ میں ہر جگہ حسینؑ کا سر اللہ کی وحدت اور بڑائی اور اس کے حکم کی شہادت دیتا تھا۔ مذہبی عقیدت اس بات کو لفظاً بھی صحیح مان سکتی ہے۔ مگر اس سے قطع نظر کرکے دیکھیے تو واقعی حسین کا سر جہاں کہیں بھی گیا ہو گا۔ زبان حال سے حکم حق کی شہادت دیتا ہو گا۔ آج تیرہ سو سال بعد بھی حسینؑ کی مثال بلکہ حسین کا نام اس کی شہادت دیتا ہے اور قیامت تک دیتا رہے گا۔ کہ حکم صرف اللہ ہی کے لئے ہے۔

جب کبھی دنیا میں حکم حقیقی کی قدر کا تسلط ہو گا۔ تو دنیا ضرور یاد کرے گی کہ اس کے سب سے بڑے محسن کے نواسے نے کس طرح اس کی حمایت میں اپنی جان نذر کر دی تھی۔ جب دنیا میں افراد اور اقوام ان اقدار اعلےٰ کے سیوک کی حیثیت سے ارتقاء روحانی و ذہنی کے منازل سبک رفتاری سے طے کر رہی ہوں گی۔ اور ان قدروں کے حاملوں سے ناکامی سے دو چار نہ ہونا پڑے گا۔ تو

وہ ضرور یاد کرے گی۔ کہ صدیوں پہلے اُسی بے یار و مددگار حق
پرست نے ناکامی سے ڈرے بغیر ان اعلیٰ اقدار کی حمایت کی
ہمت کی تھی۔ اور جب دنیا کی طاقت و جبروت اس کے خلاف کھڑی
تو یقین کی خاطر اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا۔ جب دنیا
صرف ایک خدا سے ڈرے گی۔ اور اس طرح اور معبودوں کے ڈر سے
نجات پا چکی ہو گی۔ تو وہ یہ نہ بھولے گی کہ فاطمہؑ کے لال نے میدان
کربلا میں اپنا سر کٹوا دے کر اس اطاعت اور سربلندی کا مظاہرہ
کیا تھا۔ اس وقت یہ بے تاج حکمرانوں کا حکمراں دکھائی دے گا۔ یہ
نام دین و ایمان کا پشت پناہ نظر آئے گا۔ اور اس کا خاک و خون
میں لتھڑا ہوا سر الٰہی سطوت و جبروت کا علم معلوم ہو گا۔ اور عارف
اجمیری کے لفظوں میں سب پر روشن ہو جائے گا۔۔۔

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ
دین است حسینؑ دین پناہ است حسینؑ
سر داد نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

از

مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی

ننھے بچے کی تربیت و پرورش کے لئے مخصوص قوتوں میں سب سے بڑی قوت وہ ہے۔ جسے باپ کہتے ہیں۔ لیکن کیا تماشہ ہے کہ وہ بزور توڑ دیا گیا۔ اور پیدا ہونے سے پیشتر ہی توڑ دیا گیا وہ آیا۔ اور اس شان کے ساتھ آیا۔ کہ جس کو لوگ پالنے والا کہتے ہیں۔ وہ مدینہ کے ایک میدان میں سویا ہوا تھا۔ سعد کے کہنے والو دوڑو اور اس بچہ کو چھاتی سے لگاؤ۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا کوئی نہیں ہے۔

جن کے پاس سب کچھ تھا۔ انھیں ڈھکیل دیا گیا۔ جس کی اونٹنی کا تھن خشک ہو چکا تھا۔ اور خود جس کے پاس دودھ کا ایک قطرہ نہ تھا، کچھ نہ تھا، اسی نے گود میں اٹھا لیا۔ جب واپس کرنے آئی تو تماشہ کا یہ کیسا دردناک حصہ تھا کہ ابواء کے ایک جھونپڑے میں اس بچے کی تربیت و پرداخت کرنے والی دوسری قوت بھی ہمیشہ کے لئے گم ہو گئی۔

پیر مرد، بوڑھا دادا اٹھتا ہے، اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے لیکن قدرت جس کے ساتھ کچھ نہیں رکھنا چاہتی۔ وہ اٹھتی ہے اور اس ہاتھ کو بھی جھٹک کر علیحدہ کر دیتی ہے۔ اب کوئی نہیں، اس بچہ کا کوئی نہیں، اس کے پاس کچھ نہیں! ہاں بہت سے چچا ہیں۔ لیکن جن کے پاس بہت کچھ تھا۔ انھوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ان میں جو سب سے زیادہ نادار تھا۔ اس کے بچوں ہی میں وہ بھی ہل مل گیا۔ چچا نے نہیں بلکہ بھتیجے نے بکریاں چرا کر اس کو کچھ دیا۔ اور اسی میں سے کچھ خود بھی کھا لیا۔

الغرض ایک بچہ پیدا ہوتا ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) جس کے ساتھ نہ باپ کی قوت ہے نہ ماں کی قوت، نہ اقربا اور اعزا کی قوت ہے۔ کوئی قوت نہیں ہے حتے کہ وہ جس ملک میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ بھی ہر قسم کی نباتاتی اور حیوانی قوتوں سے خالی ہے۔ میدان ہے۔ اور چٹیل میدان ہے۔ اس کا نام بن کھیتی کا بیابان ہے، نہ اس کے آغوش میں ندیاں بہتی ہیں۔ اور نہ دریاؤں کا شیریں پانی اس کو سیراب کرتا ہے، نہ سرسبز مرغزار ہیں۔ نہ نظر فریب گلزار ہیں۔ الغرض انسانی دل و دماغ کے سنوارنے اور ابھارنے میں جن قدرتی ذرائع کو دخل ہے ان میں سے بھی اس میدان میں کچھ نہیں ہے۔ وہ جس شہر میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے باشندوں کے پاس بھی کوئی قوت نہیں ہے، نہ ذہنی

قوت، نہ سیاسی طاقت، نہ علمی زور، یعنی جن قوتوں پر قوموں کی تعمیر کھڑی ہوتی ہے۔ وہ ہر ایک سے خالی ہیں۔ نہ وہ آئین رکھتے تھے، نہ دستور، نہ ان کا کوئی بادشاہ تھا۔ نہ ان کی جماعتی پراگندیوں کا کوئی شیرازہ بند، نہ ان کے پاس مکاتب تھے۔ نہ مدارس نہ کارخانے نہ فیکٹریاں کچھ نہیں، ان چیزوں میں سے ایک نہیں۔ جس میں داخل ہوکر کوئی بچہ پروان چڑھ سکتا ہے۔ ان کے پاس جو جسمانی طاقت تھی اس کا مصرف بھی بجز اپنی تعداد گھٹانے کے اور کچھ نہ تھا۔

اسی ملک میں، اسی شہر میں اسی قوم میں ایک بچہ کا ظہور ہوا اور اس شان کے ساتھ ہوا کہ اس کے سر پر جو قوت بھی سایہ فگن ہو سکتی تھی یا ہوتی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے مٹا دی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ آخر میں ہوا کہ وطن پر جو اسے بھروسہ ہو سکتا تھا۔ اس بھروسہ کو بھی ہٹا دیا گیا۔ برادری والوں میں جو اعتماد ممکن تھا۔ وہ بھی ناممکن کر دیا گیا۔ یعنی سارا وطن، وطن والے، قبیلے والے، کنبے والے سب اس کی دشمنی پر متفق ہو کر آمادہ ہو گئے۔ اور وہ جس کے پاس نہ باپ کی قوت تھی اور نہ ماں کی، نہ دادا کا زور تھا، اور نہ کسی کا۔ نہ حکومت کی سرپرستی اسے حاصل تھی۔ نہ مدرسوں کی تعلیم سے وہ فیضیاب ہو سکتا تھا نہ اپنے ملک کے گرد وپیش کے خنک آمیز اثرات سے اپنے دماغ تازگی اور اس میں بالیدگی پیدا کر سکتا تھا۔ اب اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ گھر والے، کنبے والے، قبیلے والے وطن والے سب کے سب

اس سے علیحدہ ہو گئے۔ یا وہ ان سے علیحدہ کر لیا گیا۔ اور اب جا کر یہ
ارادہ پورا ہوا دیکھو!

"اس کے پاس کچھ نہیں ہے"

وہ ساری قوتیں جن کو لوگ قوت کہتے ہیں۔ اور جن کا نام محسوس
پرستوں کی اصطلاح میں "قوت" ہے "زور" ہے ایک ایک کر کے الگ
کر لیا گیا۔ اس کے بعد دیکھا گیا۔ مشاہدہ کرایا گیا کہ۔
"جس کے پاس کچھ نہیں ہے دیکھو! کہ اس کے پاس سب کچھ ہو گیا
ایک منظر وہ تھا اور دوسرا منظر یہ ہے کہ وہ زمین کے ایک بڑے
قطعہ کا مالک ہے۔ اس کے خادموں سے نیچے اگر کوئی درجہ ہو سکتا
ہے۔ وہی قیصر کی ٹوپی اچھال رہے ہیں۔ کسریٰ کے جلال و جبروت
کے پرزے اڑا رہے ہیں۔ وہی جس کے پاس کچھ نہ تھا۔ کیا دنیا
نے نہیں دیکھا۔ یا نہیں دیکھ رہی ہے۔ یا نہیں دیکھے گی۔ کہ وہی
دنیا میں سب سے بڑا قرار پایا۔ قومیں اس کی تقدیس میں مصروف ہیں،
نسلیں اس کے سراہنے میں منہمک ہیں۔ افغانستان کی پہاڑیوں
میں، مراکو کی وادیوں میں، مصر کے ایوانوں میں۔ ہندوستان کی بستیوں
میں چین کی آبادیوں میں۔ افریقہ میں، ایشیا میں، یورپ میں۔ امریکہ
میں کون ہوا؟ اتنا بڑا کون ہوا؟ صرف ہمارے پاس نہیں۔ ہماری تاریخ
میں نہیں دوسروں کی تاریخ میں۔ کیا اس سے بھی انسان نسل اول میں

کوئی ظاہر ہوا۔ مامون وہارون کو کس کی غلامی پر ناز تھا۔ صلاح الدین کس کے نام پر صلیب والوں کی بھیڑ میں لرزہ ڈالتا تھا۔؟ محمود کس کی جوتیوں کے صدقے میں مشرق کا اولوالعزم فاتح قرار پایا۔ شاہجہاں کس کے نام کی تسبیح پڑھتا تھا۔؟ عالمگیر کس کی نگہ کرم کے لئے دکن سنگستانوں میں سالہا سال تک ٹھوکریں کھاتا پھرا تھا۔ یہ کس کی ہمنامی کی برکت تھی کہ اناطولیہ کا ترک قسطنطنیہ کی دیواروں کو پھاند گیا۔ یہ کیا تھا؟ اس نے دعوے کیا تھا۔ اور یہی اس کی زندگی کا مقصد تھا کہ محسوس قوتوں کا انکار کرے۔ اس نے دعوے کیا۔ اور نہایت بلند آہنگی سے دعوے کیا۔ اور خود اس کی دلیل بن کر دنیا کے سامنے آیا۔ کیونکہ قیاسی حجتوں کا زمانہ نکل چکا تھا۔ مشاہدات اور تجربات کا وقت آرہا تھا۔ پس اس عہد کے جو پیغمبر تھے صلی اللہ علیہ وسلم ان کا دعوے بھی تخمینی مقدمات سے نکالے ہوئے نتائج پر مبنی نہ تھا۔ بلکہ کھلا ہوا تجربہ صاف اور واضح مشاہدہ پر اس کی بنیاد کھڑی کی گئی۔ دنیا نے دعوے کو سنا دلیل کو دیکھا! پھر ان میں سے کس کے ہوش قائم رہے۔ کلیسا میں تزلزل پیدا ہوا۔ لوتھر نے ایک ضرب شدید سے پوپی تنظیم کی بنیادوں کو ہلا دیا۔ اور خود بنایا نہیں۔ لیکن قصر تثلیث کے اہم حصہ کو اس نے اپنے ہاتھوں برباد کر دیا۔ کیا کوئی اس کا منکر ہو سکتا ہے کہ تثلیث کی یہ جزئی شکست

اسی دعوے اور دلیل کا نتیجہ نہ تھا۔ جس کی ابتداء عرب سے ہوئی۔ اور کیا ان ہی میں جو یونیٹی پر آج خطبہ دے رہے ہیں وہ عالم کے اس سب سے بڑے انسان کے احسان سے سبکدوش ہو سکتے ہیں، شراب پر احتساب قائم کرنیوالو! دیکھو حق سے آنکھیں بند نہ کرو، شرکستان میں کبیر کیوں پیدا ہوا نانک کس دباؤ سے بے چین ہوا۔ رام موہن رائے کس کی گرفت سے مضطرب تھا۔ اور آج ہندوستان کے طول و عرض میں جو وہ جماعت نظر آتی ہے جسے اسلام سے عداوت کا دعوے ہے لیکن اسی کے ساتھ وہ [illegible] میں بھی مصروف ہے۔ کیا اس اعلی فرمانبردار ذہنی نافرمان فرقے کو اس دعوے کے اثر سے آزاد کہہ سکتے ہیں

لیکن اثبات دعوے کا یہ ایک ایجابی پہلو تھا۔ یعنی اس وقت تک یہ دکھایا گیا کہ

"کچھ نہ تھا اور سب کچھ ہو گیا"

مگر اثبات دعوے کا دوسرا رخ ابھی تشنہ تھا۔ ایجابی پہلو کا مشاہدہ ہو گیا۔ اور کامل طور پر لیکن اسی کا سلبی پہلو یعنی

"سب کچھ تھا اور کچھ نہ ہوا"

دل چاہتا تھا کہ اس کا بھی مشاہدہ کرا دیا جاتا۔ تو پھر محبت تمام ہو جاتی شک و ریب کی گنجائش باقی نہیں رہتی، ایجابی پہلو کا تماشہ

تم نے مکہ کی وادی میں کیا۔ اب آؤ، کربلا میں آؤ اور دیکھو کہ اس دعوے کی دلیل کا سلبی طور پر کس طرح مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔

محسوس قوتوں میں سب سے بڑی قوت سلطنت کی ہے ہم جس رقبہ کے بادشاہ ہیں۔ اس علاقہ میں سب سے بڑی قوت والا کون ہو سکتا ہے۔ اور بادشاہوں سے تو رعایا کے کسی نہ کسی فریق کو کچھ نہ کچھ خصومت بھی ہوتی ہے، یہ قوت اس قوت اور بڑھ جاتی ہے جب شاہی کے بجائے شاہزادہ کا طرہ میرے سر پر لہرا رہا ہو۔ کہ شہزادہ رعایا کے لئے مایۂ امید اور بضاعت توقعات ہوتا ہے۔ ہر شخص اس کی خوشامد میں اس لئے منہمک ہوتا ہے کہ آئندہ چل کر اس کی نگاہ کرم کا وہ مورد بنے۔ لیکن شاہوں کے شہزادوں کی حکومت تو صرف اجسام پر ہوتی ہے۔ اس پیر یا مرشد کی قوت کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ جو لوگوں کے جسموں پر نہیں۔ بلکہ قلوب پر حکومت کرتا ہو اور پیری کا درجہ اس وقت کس قدر بلند ہو جاتا ہے۔ جب وہ نبوت کی شان میں ظاہر ہو۔ یہ دنیا کی چوٹی کی قوتیں ہیں۔ جنھیں ہم زور کہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کوئی طاقت ان طاقتوں سے بالاتر نہیں، پھر اس شخص کی قوت کو سوچو جو شہزادہ بھی ہو اور دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا شہزادہ ہو، کیونکہ جس زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت بقول جرجی زیدان کرۂ زمین پر سب سے بڑی قوت دو ہی تھیں رومی دولت اور ایرانی سلطنت، جس قوم نے ان دونوں قوتوں کو

توڑ دیا۔ اس سے ساری زمین کی قوت توڑ دی۔ اور اس سلسلے میں کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں اسلام دنیا کی سب سے قوت تھی۔ وہ اسی سلطنت کا شہزادہ تھا۔ جہاں باغی رہتے تھے۔ وہاں جاتا تو شبہ کی گنجائش تھی۔ وہ شام نہیں بلکہ عراق آیا۔ جو اس کے پدر بزرگوار کا پایہ تخت تھا۔ کوفیوں کے پاس آیا۔ جو اس کے والد کے نمک خوار سپاہی تھے۔ اور صرف شہزادہ نہیں بلکہ وہ ان کا پیر زادہ بھی تو تھا۔ کیا ان میں سے ہر ایک اس کے والد کرم اللہ وجہہ کو اپنا روحانی پیشوا نہیں جانتے تھے؟ کیا ان کی والدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ان کی نگاہوں میں سیدۃ النساء العالم نہیں تھیں؟ اور صرف پیرزادہ ہی تو نہیں۔ وہ ان کا نبی زادہ بھی تو تھا۔؟ اور کیا نبی زادہ کو اس کے جد امجد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ان کے قلوب میں کسی مخلوق کی عظمت کی گنجائش نہیں تھی۔

الغرض امام حسین علیہ السلام جس وقت کربلا تشریف لائے ہیں تو کون انکار کر سکتا ہے کہ اس وقت وہ شہزادے بھی تھے پیرزادے بھی تھے۔ نبی زادے بھی تھے۔ اور خود ان کے تقوائے و ورع زہد وصفا کی عام دھاک دنیائے اسلام پر قائم تھی، ان قوتوں کے ساتھ وہ آتے ہیں، اور اپنے والد کے پایہ تخت میں آتے ہیں، اپنے والد کی فوج میں، ان کی چھاؤنی میں آتے ہیں، سوچنا چاہیئے کہ قوت کی اتنی جہات کسی ایک شخصیت میں آج تک جمع ہوئی ہیں۔ یا ہو سکتی

ہیں؟ میں نے معمولی پیرزادوں کو دیکھا ہے کہ جب وہ اس شہر یا اس گاؤں میں داخل ہوتے ہیں۔ جہاں ان کے والد کے کل باشندے نہیں بلکہ بعض لوگ مرید ہوتے ہیں۔ تو پھر ان کو ان مریدوں کی قوت پر جو ناز ہوتا ہے۔ شاید شہزادوں کو بھی اپنے ممالک محروسہ میں نہیں ہوتا۔ لیکن یہاں شہزادگی بھی ہے۔ پیرزادگی بھی ہے۔ اور نبی زادگی بھی ہے۔ اور دنیا کی سب سے بڑی قوت کی طرف سے یہ امتیازات قدرتی طور پر ان کو حاصل ہیں۔

الغرض عالم محسوسات میں جو کچھ ممکن ہے۔

"سب کچھ ہے"

مگر اثباتی دعوے کے اس تجربی پہلو کا مشاہدہ کرو۔ جس کا نام میں نے "سلبی شہادت" رکھا ہے کہ باایں ہمہ قدرت و قوت زور و طاقت دنیا نے دیکھا، آسمان نے دیکھا، زمین نے دیکھا، اور قیامت تک دیکھتی رہے گی۔ کہ

"کچھ نہ ہوا"

امام حسین علیہ السلام شہید ہو گئے، ان کی نعش مبارک پامال ہوئی۔ ان کا سر مبارک کاٹا گیا۔ سچ یہ ہے کہ محسوس قوتوں عقلی وسیلوں خود ساختہ ذریعوں کو امام حسین علیہ السلام کے پاک خون سے جس طرح دھو کرنا پید کیا کسی نے نہیں کیا۔

اے شاہی جلال! تو بھی بے کار ہے، اے شہزادگی تیرے اندر

بھی کچھ نہیں۔ اے پیرزادو سوچو! ان بستیوں میں پہونچکر سوچو! جہاں تمہارے خاندانی مرید رہتے ہیں۔ کہ ان کی محسوس قوتوں کی تہ میں نفی اور عدم کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جو قوت محسوس ہو رہی ہے۔ وہ کچھ نہیں ہے۔ اور جو نہیں محسوس ہوتی وہی سب کچھ ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء کے دعاوی کا اثبات علمی اور تجربی شکل میں نانا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ابتدائی زندگی سے دیا۔ اور نواسہ علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں بھی صرف اسی کا مشاہدہ کرایا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے یہ غلط لکھا ہے کہ جو "صورۃ" کسی کے ساتھ مشابہ تھا۔ وہ معنًا بھی اسی کے فرائض کی تکمیل کرکے دنیا سے روانہ ہوا۔ اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم انک حمید مجید!

امامت کبریٰ

خلیل علیہ السلام نے بھی قربانی دی تھی، بیٹے کی قربانی دی تھی۔ اور بلاشبہ ان کی قربانی [illegible] تھی لیکن پھر بھی اس کا اثر باطن سے ظاہر تک منتقل نہ ہوا۔ دیکھئے! اس کے صلہ میں جو انعام انی جاعلک للناس اماما کے ذریعہ [illegible] بشکل "امامت کبریٰ" عطا ہوا اس میں بھی ظہور کی شان [illegible] تھا۔ یہ سچ ہے کہ عیسائی، یہودی، مسلمان جو دنیا کی [illegible] مشہور قومیں ہیں۔ وہ ابراہیم کو اپنا امام مانتی ہیں، اور پادریوں [illegible]

دعوا ہے کہ ان کا دستور اول (پیغمبر اول) وہ شخص تھا جس نے خانہ کعبہ کی بنیاد ڈالی۔ ہندو بھی کہتے ہیں۔ کہ ہمارا سب سے بڑا رشی برآہما تھا۔ اسی کے منہ سے جو بات نکلی ہم اس کو وید کہتے ہیں۔ جیسا کہ بعض کہتے ہیں کہ ہندوؤں کا برآہما وہی ہے۔ جسے تورات میں ابرآہام اور ابراہیم کو قرآن میں ابراھیم سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور صحف ابراہیم جن کا سراغ قرآن سے ملتا ہے۔ جس شکل میں تورات وانجیل وزبور ہے نہیں۔ ممکن ہے کہ ترجمہ در ترجمہ ہو کر وید کی منسوخ ومنسوخ شکل میں وہی صحیفے موجود ہوں۔ اور اگر یہ ثابت بھی ہو جائے تو مورخ کے لئے یہ کس قدر مشکل ہے۔ بدھ کی تعلیمات کا سرچشمہ وید کو قرار دے۔ بہر حال مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں۔ میں تو یہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہ ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کا اثر باطن سے ظاہر تک متعدی نہ ہو سکا۔ اس لئے ان کی امامت میں بھی ظہور کا رنگ بہت ہلکا رہا۔ جو ان کو مانتے ہیں۔ وہ براہ راست نہیں مانتے اور جو نہیں مانتے، دوسروں کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاید ان کو ہی مانتے ہیں۔ یہ تو ہبی کی قربانی کا اثر تھا۔

پھر جو قربانی کربلا میں ہوئی۔ وہاں باطن نے ظاہر کی حقیقت نے مجاز کی شکل میں ظہور کیا۔ مینڈھا نہیں بلکہ خود امام حسین علیہ السلام ذبح ہوئے۔ خدا کے سامنے ذبح ہوئے۔ اس کی ساری قوتوں کے سامنے ذبح ہوئے۔ جبرئیل واسرافیل کے سامنے ذبح ہوئے۔ ملائکہ روحانیین

اور ارواح مقربین کی آنکھوں کے نیچے ذبح ہوئے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں ذبح ہوئے۔ دوسروں کے ہاتھ سے نہیں اپنے نانا کی امت کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔

ان نکات کو کون سمجھ سکتا ہے کہ یزیدیوں کے پاس حضرت حسین کی شہادت کے لئے کوئی نیزہ نہ تھا۔ قادسیہ کے کافروں کی کمر میں اس فضیلت تک پہونچانے کے لئے کوئی خنجر نہ تھا۔ کیا مصلحت تھی جن کے حکم کے سوا اور کوئی کسی کا حکم نہیں۔ اس کی کیا مرضی تھی۔ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند علیہ السلام ذبح ہوں۔ اور ان ہی کی بنائی ہوئی جماعت کے ہاتھوں ذبح ہوں۔ تاریخوں میں جو یہ مرقوم ہے۔ کہ جب امام علیہ السلام نے دریافت کیا۔ کہ دشمنوں کا کیا حال ہے۔ تو بالاتفاق آپ کو یہ خبر سنائی گئی۔ کہ "اے امام! قلوب آپ کے ساتھ ہیں۔ لیکن ہاتھ آپ کے خلاف ہیں چلیں گے"

یفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید کی حکمت مطلقہ میں ہم سرچپ ہیں۔ وہ پاتے ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا دل اپنے بچہ کو ذبح کرتے وقت مضطرب نہ تھا۔ اگر مضطرب نہ تھا۔ تو پھر ان کے لئے اجر کیا تھا؟ مضطرب ہو اور نہ مضطرب ہو۔ ساری بنیاد تو اسی

سلہ اس کے متعلق شاہ عبدالعزیز صاحب نے سرالشہادتین میں متعدد حدیثیں پیش کی ہیں۔ اور اس کی توثیق کی ہے۔

پھر ہے۔ ورنہ گلہ رے اپنے جوان بچے کو جسے وہ پہچان بھی نہیں سکتی۔ اگر اس نے اپنے سینگ سے مار ڈالا۔ تو اس کے لئے کیا اجر ہے۔

بہر حال کربلا میں جو قربانی دی گئی۔ یہی ایک ایسی قربانی تھی۔ جو باطل سے منتقل ہو کر ظاہر کے پردہ پر جلوہ پرداز ہوئی۔ جو اندر تھا۔ وہ باہر بھی آگیا۔ حقیقت نے مجاز کو بھی حقیقت ہی کے رنگ میں رنگین کیا اسی کو کہا جاتا ہے کہ اس قربانی والی امت کبرے جیساکہ باطن میں عام تھی تام تھی۔ اسی طرح ظاہر میں بھی عام ہوئی تام ہوئی۔ اس امامت والے امام کو کافۃ للناس بشیراً و نذیراً کی سند دی گئی۔ تاکہ سب جانیں سب مانیں۔ اور پھر اس سند پر ختم نبوت کی مہر لگائی گئی۔ تاکہ براہ راست جانیں، براہ راست مانیں۔ درمیان میں کوئی واسطہ حائل نہ ہو، جیساکہ ابراہیم علیہ السلام کی امامت کی شناخت میں لوگ وسائط و ذرائع کے محتاج ہیں۔ یہودیوں نے موسےٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے۔ عیسائیوں نے عیسےٰ علیہ السلام کے بیان سے، مسلمانوں نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان کی امامت کے آگے گردنیں خم کیں لیکن اس امامت کے لئے کسی واسطہ کی ضرورت نہیں۔ کسی ذریعہ کی حاجت نہیں۔ کیونکہ اس کے بعد واسطوں کی پیدائش ہی بند کر دی گئی۔

اگرچہ اس کا تصفیہ کون کر سکتا ہے کہ ابراہیم کے فرزند اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو امامت ملی۔ کیا وہ بھی اسی امامت کی ایک نشانی نہ تھی جس کی بشارت ابراہیمؑ کو دی گئی۔ جو بیٹے کو ملا۔ کیا وہ باپ ہی کو

نہ ملا۔ پھر اسی طرح ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ کربلا میں جو شہید ہوا۔ وہ بھی اسی ذبیح کا ایک جزو تھا۔ جس کو منیٰ کے گوشے میں ذبح کرنے کے لئے خلیل علیہ السلام نے پچھاڑا تھا۔ اسماعیلؑ نہیں شہید ہوئے "تو حسین علیہ السلام جو اسحاق کے نہیں اسماعیل ہی کے بچے تھے۔ کیا ان کی شہادت کو اسی مبتدا کی ہم خبر کہہ سکتے ہیں؟ عارفوں کے لئے ان اسرار میں کتنے لذائذ ہیں؟ جو پھل پیدا کرنے کے لئے سمندر سے آب خرے اڑاتا ہے۔ بادلوں کو جنبش میں لاتا ہے۔ مٹی کو لکڑی اور پتے اور آخر میں پھول کی شکل میں نمایاں کرتا ہے۔ جو آدم کو خلیفہ بنانے کا ارادہ پہلے کر لیتا ہے۔ اور ایک الزام سے ملزم بنا کر اپنے مقصد کو پورا کرتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کیا کیا کرتا ہے۔ اور کن کن اغراض کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔ ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

جس کے ابوینؑ صالح تھے۔ موسیٰ وخضر کو حکم ہوا کہ ان کے خزانہ کی حفاظت کریں۔ تاکہ باپ کی چیز بیٹے کو مل جائے۔ یہی ہوتا

۱؎ سورہ کہف میں ہے کہ خضر علیہ السلام نے جب منہدم دیوار کو بغیر مزدوری کے اٹھایا اور موسیٰ معترض ہوئے۔ تو انہوں نے جواب میں یہی فرمایا۔ کہ وکان تحتہ کنز الھما وکان ابوھما صالحا۔

رہتا ہے اور ہوتا رہے گا۔

نہ تھا نیل کا جبار کچھ نہ تھا " اس میں " ہونے " کی

ردِ امانت نمائش ہوئی، وجود ملا، وجود کے لوازم ملے، زندگی ملی۔ قوت دید ملی، شنید ملی، حشیبد ملی، سمشید ملی۔ گوشت اور ہڈی کے مرکب میں ان طاقتوں کی جلوہ نمایاں شروع ہوئیں۔ ان کی پیٹھ مضبوط کی گئی۔ اس کے بازو میں زور بھرا گیا۔ اس کی زبان میں کہربائی اثرات دوڑائے گئے۔ وہ افریقہ کے اس سرسبز گوشہ کا سورما قرار پایا۔ اس نے سونے کا تخت بچھایا۔ اور اس پر بیٹھ کر اس نے محسوس کیا کہ ملک مصر کی گردش اسی کے ارادہ اور مرضی کے نقاط پر ہوتی ہے۔ یہ کیا احساس تھا کہ اس نے اس کے دماغ کو الٹ دیا۔ سے جو کچھ دیا گیا۔ وہ محض ردِ امانت میں دیا گیا تھا۔ نظام دماغی کی معکوسی اثر کا اندازہ کرو، کہ وہ یکایک یہ باور کرنے لگا۔ کہ اسی نے سب کو دیا ہے اور اس کا دینے والا کوئی نہیں ہے۔ خود فراموشی نے خودی کا رنگ اختیار کیا اور خیانت کے جنون میں بدمست ہو کر وہ انا ربکم الاعلیٰ بڑبڑانے لگا۔ جو ایک سکنڈ کے لئے بھی اپنی ذمہ داری پر اپنے پھیپھڑے کو ہلکی سی سانس نہیں دے سکتا تھا۔ ایک بڑے ملک کے باشندوں کا۔ ان کے کھانے پینے، سونے جاگنے مرنے جینے نفع نقصان کا ذمہ دار بن بیٹھا۔ اور اپنے کو ہر قسم کی ذمہ داری سے اس نے بالاتر قرار دیا۔ اس کی شخصیت پر وہی آسیب مسلط ہو گیا

تھا۔ جو آج کل بنی آدم کی بعض نسلوں کا گلا پکڑے ہوئے ہے۔ وہ انفرادی فرعون تھا۔ اور آج کرۂ زمین پر اجتماعی اور قومی فرعون کا بروز ہوا ہے۔ پہلے اس اژدہے نے نیل کے پانی سے سر نکالا تھا اور آج افراد کو مٹا کر ذرا زیادہ شدت کے ساتھ جمہوریت کی شکل میں ٹیمز اور سین کے کنارے گرج رہا ہے۔ دونوں کی اسپرٹ ایک ہے۔ سانچوں اور قالبوں کے اختلاف پر اتنا زور نہ دیا کرو، اس کی شکایت نہیں ہے کہ انھیں وجود کیوں ملا؟ ان کی نیستی میں ہستی کی منور شعاعیں کیوں چمک رہی ہیں۔ ان میں بینائی شنوائی کے مظاہر کا ظہور کیوں ہوا؟ زمین پر ان کا رعب کیوں قائم ہے، جانی اور مالی نقصان کے خوف سے دنیا والے ان کو اپنی آمدنی کے ایک حصہ کو دینے پر کیوں مجبور ہیں۔ یہ خوف جن آلات و اسلحہ کے زور سے پیدا ہوتا ہے، وہ ان کو کیوں ملے۔

آخر ہم اس کا گلہ کیوں کریں؟ کیا ہم دینے والے کے ملک میں ساجھی ہیں۔ یا اس کا ہم سے کوئی ناطہ ہے۔ ہم پر اس کے حقوق ضرور ہیں لیکن اس پر کون حق قائم کر سکتا ہے۔ اس نے تمہارا کیا لیا جو تم اس طرح روتے ہو اور آنکھیں بسورتے ہو۔ اپنی چیز دی ہے۔ اپنی قوت دی ہے۔ اپنا ساز و سامان دیا ہے۔ کیا واقعی ہمیشہ اس کی مصلحت وہی ہوتی ہے۔ جو اس نادان بڑھیا کے نزدیک تھی اور کہتی تھی "اے خدا مجھے دے اور میرے بیٹے کو! لیکن کیا دوسرے دل

کے لئے تو قرض کرے گا"

ہم جس پر متعجب ہیں۔ اور تعجب کبھی غصہ کی اور کبھی تعصب کی کبھی عداوت کی شکل اختیار کرلیتا ہے کہ یہ دیوانے اپنے کو، اپنے علمی وعملی ذخیروں کو اپنا کیوں سمجھتے ہیں۔ امانت میں خیانت کیوں کررہے ہیں۔

جرم سے انسانی فطرت بیزار ہوتی ہے۔ چور کو کون دوست رکھتا ہے۔ ڈاکوؤں سے کسے عداوت نہیں۔ خود مجرم بھی تو اپنے جرم سے راضی نہیں، اپنے جرم کے "وصف عنوانی" سے موصوف ہونے کو اپنی اہانت خیال کرتا ہے۔ جو زانی ہے اس کو زانی کے خطاب سے مخاطب کرو۔ اور بشری جذبے کی طبعی مدافعت کا اندازہ کرو۔ کم ازکم اپنی محافظت کے لئے تم کو تعبیر کے بدلنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ جس طرح آج یورپ قبائح وسیات کی حرارت کو محاسن وحسنات کے خوبصورت عنوانوں اور تعبیروں سے ٹھنڈی کرتا ہے۔ پھر اگر ہم خائنوں سے کڑھتے ہیں۔ ان کی ہر ذلت وسکون سے ہمیں نفرت ہے۔ تو کیا سلیم فطرت اس کے سوا اور کچھ بھی کرسکتی ہے۔

تم سمجھتے ہو کہ انھوں نے ہم سے ہمارا ملک لیا ہے۔ ہماری دولت لی ہے۔ ہماری شوکت لی ہے اس لئے ہم ان سے بیزار ہیں۔ جو ملک کو اپنا ملک اور دولت کو اپنی دولت سمجھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ ایک دوسرے سے اسی لئے چڑھتے ہیں۔

لیکن ہم سے تو ترکوں نے، پٹھانوں نے، مغلوں نے اور
خدا جانے کن کن لوگوں نے دولت بھی لی، سلطنت بھی لی، سب
کچھ لیا، پھر کیا ہم میں سے کوئی ان سے اس وقت تک بیزار ہوا جب
تک کہ ہم نے اپنے کو اپنا نہیں سمجھا۔

بہر حال میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ میری غرض تو یہ تھی۔ کہ مصر
کے محدود رقبہ میں جس کے پس پشت قوت کی نمائش ہوئی تھی
اور جس کے غلط انتساب نے غلطیوں کا انبار قائم کردیا تھا۔ کیا
تماشہ ہے۔ وہ اس کو واپس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یکایک
سب کی سب واپس لے لی گئی۔ پانی کے باہر اس کا سب کچھ تھا۔ مگر
چند قدم فاصلہ سے پانی کے اندر اس کا کچھ نہ تھا۔ اور

كم تركوا من جنت
وعيون وزروع ومقام
كريم ونعمة كانوا
فيها فاكهين!

اور کتنے باغ کتنے سر چشمے۔ اور کتنے پر
شکوہ بنگلے اور وہ ساری نعمتیں جن
میں وہ مزے لے رہے تھے۔ چھوڑ
بیٹھے۔

ان چیزوں کو امانت سمجھ کر اس نے صاحب امانت کی طرف
خود نہیں لوٹایا۔ بلکہ اس سے زبردستی یہ چیزیں چھینی گئیں۔ پھر کیا
اس دردناک سانحہ پر کوئی رویا۔ کسی کے دل میں افسوس کا جذبہ ابھرا
ان پر کسی نے آنسو بہائے۔ ان کے لئے کوئی چیخا؟ یہ سچ ہے کہ آج
جو اس کے گدی نشین اور اس کے دماغی مرض کے وارث ہیں۔ وہ

اس کی اور اس کے آباؤ اجداد، اس کے امراء۔ اور اس کے وزرا کی قبروں کی جستجو میں سرگرداں ہیں۔ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو جو زندہ اجسام کی اعانت کے لیئے دی گئی ہیں۔ وہ مردہ لاشوں کی تلاش میں صرف کر رہے ہیں۔ مصر میں مُردوں کو ٹٹولا جاتا ہے اور زندگی کی گردنیں مروڑی جاتی ہیں۔ اور جس طرح نوحؑ و ابراہیمؑ موسےٰؑ و عیسےٰؑ کے وارثوں نے اپنے بزرگوں کے نام بلکہ کام سے معمورۂ عالم کو بھر دیا ہے۔ اسی طرح یہ بھی چاہتے ہیں۔ کہ ان گمنام ملعون مورثوں کے سیاہ کارناموں کو علی الرغم روشن کریں، یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور بڑے تزک و احتشام سے ہو رہا ہے۔ لیکن خدارا یہ بتاؤ! کہ ان میں سے ان ڈوبنے والوں کی لاش پر کون رویا۔ ان کی اونچی محل سراؤں پر کون آب دیدہ ہوا۔ ان کی فراواں دولت کے ڈھیر پر کس نے دھاڑیں ماریں! تم دیکھو یا نہ دیکھو! لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اپنے بزرگوں کی لاشوں سے یہ مداری کے بندروں کا کام لیتے ہیں۔ میوزیم میں رکھتے ہیں۔ ٹکٹ لگاتے ہیں۔ پیسے وصول کرتے ہیں۔ ان کے کفن کے ساز و سامان کے چرانے میں ایک دوسرے پر کتے کی طرح غراتے ہیں۔

اور واقعہ یہ ہے کہ خائن مجرم تھا۔ مجرم نے جرم کی سزا پائی پھر اس پر کون رو سکتا ہے۔ صدیق مولانا الکریم

فما بکت علیہم   پھر نہ ان پر آسمانوں نے

السماء والارض گریہ کیا۔ اور نہ زمین روئی۔
(حق سبحانہ تعالےٰ)

لیکن اس کے مقابلے میں جو فرات کے ساحل میں آیا۔ اپنے کو لے کر آیا۔ اپنی آنکھوں اور کانوں کو لے کر آیا۔ اپنی قوتوں کو لے کر آیا۔ اپنے تمام اعضا کو لے کر آیا۔ اپنے بال بچوں سمیت آیا۔ اپنی عزت و آبرو اپنے ناموس کو لے کر آیا۔ اپنی شاہزادگی کی طاقت، پیرزادگی کے اعتماد کو لے کر آیا۔ اپنی نبی زادگی کے جلال کو لے کر آیا۔ بلکہ خود اپنے زہد و تقوےٰ ولایت و کرامت کی قوتوں کو لے کر آیا۔ زبردستی نہیں بلکہ راستی سے آیا۔ خوشی سے آیا۔ روکنے والوں نے روکا لیکن وہ بے تحاشہ رد امانت کے لئے امتحان کے میدان میں جا پہنچ کے دنگل میں اتر گیا۔ کیا وہ شامیوں کے فلزاتی تخت کے لئے اترا۔ بنی امیہ کے پاس مٹی کی بالائی سطح کا جو چھلکا تھا۔ کیا وہ اس کے لئے آیا۔ کیا واقعی اس کے سامنے ابن زیاد تھا۔ یا یزید کا سپہ سالار تھا۔ لوگ کچھ ہی سمجھیں لیکن عارفوں نے دیکھا تھا۔ اور جیسا کہ تاریخوں میں بھی ہے کہ وہ صف جنگ میں

• لا الہ الا اللہ سبحان اللہ و بحمدہٖ

کا نعرہ لگا رہا تھا۔ پس کون جان سکتا ہے کہ کس لئے آیا تھا؟ اور کس کے سامنے آیا تھا۔ اور یہ لین دین کن دو ہستیوں کے درمیان تھا اس پر پانی بند کیا گیا۔ اس کے خشک ہونٹ، سوکھی زبان اسکی کب

تھی جو پرواہ کرتا۔ اس سے اعزہ سے گردنیں مانگی گئیں۔ اس نے واپس کردیں اس سے ننھے بچوں کا خون طلب کیا گیا۔ اس نے حاضر کردیا اس پر تیروں کی بارش ہوئی۔ اس نے قبول کرلیا۔ اس کا جسم چھپ گیا وہ دم بخود کھڑا رہا۔ اس کے جسم پر تلوار کی دھار ماری گئی۔ وہ سر جھکائے کھڑا رہا۔ اس کے سر سے گردن الگ کردی گئی۔ اور اس خدا کے سامنے الگ کی گئی۔ جو اس کے ساتھ تھا۔ پھر کیا اس نے انکار کیا؟ اس کے گھر کا ادنےٰ خادم معنول ملائکہ تھا۔ فہیرہ بن مالک کی لاش کو ملکوت والوں نے چھپالیا۔ لیکن اسی گھر کا جو سردار تھا اس کی نعش مبارک پر گھوڑوں نے ٹاپ مارے۔ اس کی ہڈیوں کو کچلا۔ اور آسانی کے ساتھ یہ مراحل طے ہوگئے۔ آخر میں اس کی عزت وناموس پر بھی حملہ کیا گیا۔ اس کے گھر کی خاتونوں کو جنت کی خاتون کی لخت جگر تھیں۔ ان کو رسیوں میں باندھا گیا۔ زمین پر گھسیٹا گیا اور یوں اس کو جو کچھ دیا گیا۔ ہنستے ہوئے چہرے۔ مسکراتے ہوئے لبوں کے ساتھ اس نے سب واپس کردیا۔ اور ان تولا مانات الی اہلہا کی ایک ابدی تفسیر جریدہ عالم پر اسی کے بدولت ثبت ہوئی نہ اتنا کسی کو ملا۔ اور نہ اتنا کسی نے دیا۔ کون اندازہ کرے۔ اس شخص کی نعمتوں کا کون اندازہ کرے۔ جو خالق کے محبوب کا محبوب تھا۔ وہ اس کا پیارا تھا۔ اس کے کندھے پر کھیلنے والا تھا۔ اس کی پشت مبارک کا سوار تھا۔ اس کے لب ہائے اقدس کا وہ بوسہ گاہ

تھا۔ کیا آفتاب اس کے حکم کا منتظر نہ تھا۔ زمین اس کے آگے جھکی ہوئی نہ تھی۔ جبرئیل امین اس کے فرمان سے سرتابی کر سکتے تھے۔ فرات اس کا نہ تھا۔ تو پھر کس کا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے میدان کربلا میں تلوار چلائی۔ نیزے کو جنبش دی۔ حالانکہ کیا کسی مستند تاریخ سے اس کو ثابت کر سکتے ہیں۔ اس کی تلوار کی باڑھ کون سنبھال سکتا تھا۔ جب اس کے الفاظ کی برداشت کی صلاحیت کسی میں نہ تھی۔ قاسم نے جب یا عم کہکر پکارا اور ضبط نہ ہو سکا تو کس نے نہیں دیکھا۔ کہ قاتل کا گھوڑا اپنے سوار کو پیٹھ سے گرا کر گھسیٹتا جاتا تھا۔ اور چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر اس کی لاش پارہ پارہ ہو گئی۔

بہر حال نیل کے کنارے خائن سے امانت چھینی گئی۔ پھر نہ اس پر آسمان رویا۔ اور نہ زمین روئی۔ اور فرات کے ساحل پر امین صادق نے امانت واپس کی۔ پھر دیکھو! اس پر دنیا روئی۔ قوموں نے ماتم کیا۔ انسانوں نے آنکھوں سے آنسو بہائے۔ صدیوں نے اس کے نوحہ کو سنا۔ قرنوں میں اس کا گریہ و بکا گونج رہا ہے۔ افغانستان سے کراہ کی آواز آرہی ہے۔ تیونس والوں کا دل پاش پاش ہو رہا ہے۔ ہندوستان کے اکثر شہر اور اس کی بستیوں میں نالے بلند ہو رہے ہیں۔ ایران کا کلیجہ پھٹ رہا ہے۔ عرب کی آنکھوں میں بھی آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ مصری بھی بے چین ہیں۔

الغرض جس نے امانت میں خیانت کی تھی۔ اس پر [illegible]

جاہ وحشم پر، مال و دولت پر، نہ آسمان رویا، نہ زمین روئی اور جس نے
امانت کو پوری قوت کے ساتھ، نہایت صفائی کے ساتھ۔ بغیر کسی
آلودگی کے واپس کیا۔ اس پر عرب وعجم سب کے سب مصروف گریہ
وبکا ہیں صدیوں سے ہیں۔ قرنوں سے ہیں اور اب تو اس پر تیرہ
سو برس گذر چکے ہیں۔ یہ رونا نہ تھمے گا۔ یہ ماتم ختم نہ ہوگا۔

کون ہے؟ نسل انسانی میں کون ہے؟ جس پر آسمان و زمین
تو خیر آسمان و زمین جس کے لئے ہے۔ یعنی بنی نوع انسانی نے اس غم
کا اظہار اس طرح کیا ہو۔ کیا ہندو کسی پر اس طرح روئے، کیا عیسائی
اپنے کسی شہید پر اس درجہ غمزدہ ہوئے۔ کیا بدھ کے پیروؤں
میں اس کی کوئی نظیر ہے۔ کیا یہودیوں کا کوئی شہید اتنا مشہور
اتنا بلند ہے۔ کیا پارسیوں کی محدود جماعت کی کوئی قربانی اس
احترام کی مستحق قرار پائی؟ پرانی تاریخوں میں بلاشبہ ایسے قتیل
نظر آتے ہیں جن کے خون کو دیکھ کر انسانی فطرت بہت مضطرب
ہوئی ہے۔ اور کچھ ان کے لئے کسی مخصوص ملک کے کسی خاص علاقہ
میں ان آنسوؤں نے اضطراب کی شکل اختیار کی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ
اتنی وسعت زمانی و مکانی اتنی گہری اور عمیق غمناکی کی نظیر تاریخ میں
کون دکھا سکتا ہے۔ اور یہی مراد ہے سر الشہادتین میں حضرت شاہ
عبدالعزیز صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی
شہادت جہری شہادت تھی۔ اور اسی وجہ سے شہرت میں اتنا بلند

تبہ حاصل کیا

"خائن" کے متعلق جب قرآن مجید کا نص قطعی وارد ہے۔ "مابکت علیہم السماء والارض" اور محل طعن و ملامت میں واقع ہے۔ تو کیا ان شخص پر آسمان و زمین سے بھی زیادہ گرامی ہستیاں روئیں۔ اس سے ان کی تعریف و تقدیس نہیں نکلتی؟

یہ سچ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

انا بری ممن حلق و	جس نے مرنے کے ماتم میں سر منڈایا اور
صلق و خرق	زور زور سے چیخا۔ اور کپڑے پھاڑے
(بخاری و مسلم)	میں اس سے بری ہوں۔

اور بلا شبہ حدیث میں ہے کہ:-

لیس منا من ضرب الخدود	جو گالوں پر طمانچے مارتا ہے یا گریبان چاک کرتا
و شق الجیوب و دعا بدعوی	ہے یا جاہلیت والوں کی طرح بین کرتا
الجاہلیہ (بخاری)	ہے۔ وہ ہم میں سے نہیں۔

پھر کیا ان حدیثوں کے بعد بھی میں ان نادانوں کی تائید کروں گا جو اپنے سینوں پر لوہے کی زنجیریں ٹپکتے ہیں۔ یا اپنے بال نوچتے ہیں یا مصنوعی آوازوں کے ساتھ ایام جاہلیت کے دستور کے مطابق ڈھاڑیں مارتے ہیں۔ میں ان سے وہی کہوں گا۔ جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے سعدؓ بن عبادہ کی عیادت کے وقت صحابہؓ کرام کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا تھا۔

الا تسمعون ان اللہ لا یعذب   کیا تم لوگ نہیں سنتے ہو۔ اللہ تعالیٰ
بدمع العین۔ ولا بحزن   آنکھوں کے آنسوؤں یا دل کی کراہ پر سزا نہیں
القلب ولکن یعذب بھذا   کرتا۔ بلکہ اس کی سزا اس پر ہے اور آنحضرت صلعم
واشار الی لسانہ (بخاری مسلم)   نے اپنی زبان مبارک کی طرف اشارہ فرمایا

مطلب یہ کہ چیخ پکار بین اور ہنگامہ ناسزا اور ناجائز امور ہیں لیکن دل کی رقت، طبیعت کے ہیجان، آنسوؤں کے سیلان کو کون روک سکتا ہے۔ بلکہ روکنے والے کو ذرا سنبھل کر سوچنا چاہیئے کہ وہ کہیں ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو تو نہیں چھوڑ رہے ہیں بخاری میں ہے کہ جب ابراہیم ابن رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نزع طاری ہوا۔ تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس پر عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ تعالیٰ نے دریافت کیا کہ رسول اللہ! آپ یا رسول اللہ روتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا۔ انہا رحمتہ (یہ رحم اور ترس ہے) اتنا فرمایا تھا کہ پھر آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم روتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے۔ آنکھیں آنسو بہاتی ہیں۔ دل غمناک اور ہم نہیں کہتے نہی جو ہمارے رب کی مرضی ہو۔

مخصوص دنوں میں اپنے کو رونے پر تم کیوں آمادہ کرتے ہو۔ کیا کربلا کا حادثہ ایسا حادثہ ہے۔ جس پر دل کی غم انگیزی کبھی ختم ہو سکتی ہے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ ماہ محرم میں یہ واقعہ زیادہ یاد آتا ہے۔ اور یہ

قدرتی امر ہے۔ ممکن ہے اس موسم میں جگر کی ٹیس زیادہ بڑھ جائے دل میں زیادہ شدت کے ساتھ ہوک اٹھے۔ اندرونی بے چینیاں برستی آنسوؤں کی شکل اختیار کر لیں۔ لیکن اس غم کے لئے دن کیوں بناتے ہو۔ جو غیر محدود سوز کا طالب ہے۔ اس کو محدود بنا کر تنگ کیوں کرتے ہو۔؟

اور میں تم پر کیا ملامت کروں۔ کہ اب تو ہمارے دشمن اور ان دشمنوں کے سحر سے مسحور ہو کر خود ہمارے گھر میں ایسے لوگ ہیں۔ جو اس جہری شہادت کو سری بنانے کی فکر میں مصروف ہیں۔ بلکہ ان میں کتنے ہیں۔ جو اس شہادت کو شہادت کے درجے سے گرانا چاہتے ہیں۔ وہ اب مشورہ دے رہے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام کو یہ نہ کرنا چاہیئے۔ اور ان کو یہ کرنا زیادہ مناسب تھا۔ پچپن سال کے بزرگ امام حسین علیہ السلام تیرہ سو برس کے بعد ان پیشہ ور مورخین کے مشوروں کے کس حد تک محتاج ہیں۔ اس کا تصفیہ خود ان کی عقل کر سکتی ہے۔

لیکن میں تو حضرت شاہ عبد العزیز رحمتہ اللہ علیہ کی اس نکتہ شناس طبیعت کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے سر الشہادتین میں لکھا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شہادت دراصل فضائل دکمالات کے سلسلہ میں ایک اہم حقیقت ہے اور "نبوت کبریٰ" جو تمام فضائل و کمالات کی آخری حد ہے ضرور تھا کہ اس میں یہ کمال بھی شریک ہو۔ لیکن "منصب نبوت" کی شان عالی میں اس سے اختلال کا اندیشہ تھا۔ اس لئے

قدرت نے اس کمال کو بجائے باپ کے "بیٹے" کی طرف منتقل کر دیا۔ شاہ صاحب نے صحیح حدیثوں سے امام حسین علیہ السلام کا فقط نواسہ ہونا نہیں بلکہ ابن، بیٹا ہونا ثابت کیا ہے۔ اور عقلی طور پر اپنے اس دعوے کو اس سے مدلل کیا ہے کہ حضرت امام علیہ السلام اپنے جسم کے نصف حصہ میں آنحضرت صلعم سے خلقتہً بہت زیادہ اشبہ تھے۔

پس جو کمال بیٹے کو ملا، وہ باپ ہی کو ملا۔ کیونکہ گو انجیل میں ہے کہ جو کچھ باپ کا ہے وہ سب بیٹے کا ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ بیٹے کا ہے سب باپ کا ہے[1] اور اسی بنیاد پر شاہ صاحب کا یہ قول بالکل درست ہے کہ جو فضیلت امام حسین علیہ السلام کو حاصل ہوئی۔ وہ دراصل سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل میں داخل سمجھی جائے گی۔ بہرحال شاہ صاحب نے یہ کس قدر صحیح ارقام فرمایا ہے کہ "فضیلت شہادت" سے منصب نبوت میں اختلال کا اندیشہ تھا۔

میں دیکھتا ہوں کہ یہی فضیلت جب نبوت سے ہٹ کر کرامات پر اور باپ سے ہٹ کر بیٹے کو ملی۔ تو ہمارے دلوں میں وسوسوں کے کتنے سمندر موج مارنے لگے۔ خصوصاً آج کتنے ہیں، جو اتفاقی واقعہ کہہ کر اس کی اہمیت

---

[1] یہ قانون اس حدیث سے پیدا کیا گیا ہے۔ جس میں ہے "انت ومالک لابیک" اور بعضوں نے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے کہ تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔ اور بعضوں نے کہا ہے کہ تو اور جو کچھ تیرا ہے تیرے باپ کا ہے۔

کے گھٹانے کے درپے ہیں۔ اور ان میں ایسے بہت ہیں جو علانیہ کہتے ہیں "جب حکومت و سلطنت سے مغلوب ہو کر کربلا میں شہید کا خون بہا "خاکم بدہن" میں نے یہ بھی سنا ہے کہ یہ اپنی خانگی صحبتوں میں اس کو جذبۂ ضد، اور ہٹ دھرمی کا ایک کرشمہ سمجھتے ہیں۔ ان کو امام کی ولایت میں شبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ ان کی ملکوتی قوتوں کے متعلق اظہار تذبذب کیا کرتے ہیں۔ وہ امام ہمام سید الشہداء علیہ السلام کے متعلق گمراہیاں پھیلاتے ہیں اور ان اوہام و وساوس کی بنیاد کیا ہے؟ وہی فضیلت شہادت جو باپ کی جگہ بیٹے کو ملی۔ اگر امام حسین علیہ السلام کربلا میں ان خصوصیتوں کے شہید ہوتے۔ تو ان وسوسوں کی کہاں گنجائش تھی؟

پھر غور کرو۔ اگر یہی شہادت "ذات نبوت" کے سامنے [illegible] ظاہر ہوتی۔ تو ان بیمار دلوں کے ایمان کا کہاں ٹھکانا تھا۔ اس وقت تو ان کو بیٹے کے عقل و اخلاق میں نقص نظر آتا ہے۔ تو آج [illegible] وہ باپ کو بری کئے پر تیار رہتے۔ ان کی بربادی تھی۔ اور کیسی بربادی تھی اور اب بھی وہ کب بربادی سے بچے ہوئے ہیں۔ انہوں نے [illegible] اعتراض کیا ہے۔ تو کیا وہ بھول گئے کہ درخت، ان کی زبان کی [illegible] سے محفوظ رہا۔ پھل اور کیسا پھل جس نے بتول رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی آغوش میں پرورش پائی۔ حیدر کرار کی نگرانی میں ہوش سنبھالا۔ [illegible] جسے کہ حبیب کو دنیا کے سب سے بڑے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم [illegible]

ماں کی طرح پالا۔ اور باپ کی طرح نگہداشت کی۔ وہی جسے ابوبکر صدیقؓ نے ہمیشہ پیار کے ساتھ وہ سب کچھ سکھایا۔ جو اس کے نانا صلی اللہ علیہ وسلم نے سیکھا تھا۔ فاروق اعظمؓ کی توجہ جس پر اپنے بچوں سے زیادہ تھی ذوالنورینؓ کو جو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔ اور سارے صحابہؓ کی آنکھوں کا جو نور تھا[1]۔ ان درختوں کی مجموعی قوت سے جو پھل پیدا ہوتا تھا۔ افسوس ہے تم پر افسوس ہے کہ تم کو کسی اور کی عقل میں تاریکی نظر نہیں آئی۔ کسی اور کے اخلاق میں ہٹ اور ضد کی کدورت تم کو معلوم نہ ہوئی۔ اور معلوم ہوئی تو کہاں معلوم ہوئی۔ تمہارے ریسرچ ورک (تفتیشی مجاہدات) کے لئے تو بڑا میدان تھا۔ پھر اسی وادی پُرخار میں اترنے کی کیا ضرورت تھی۔ ؟

جس نے پچپن سال کی عمر رضا و تسلیم، خاموشی اور خمولت میں گذار دی۔ جس نے باوجود عمدہ گھوڑوں اور پر شوکت سواریوں کے بارہا بلکہ پچیس دفعہ ڈھائی سو میل کی مسافت طے کر کے اللہ کے گھر کا حج[2] کیا۔ جس نے تین دفعہ اپنی ساری مملوکات سے دست بردار ہو کر بے خانماں ہو کر اپنا سب کچھ لٹا دیا[3]۔ تم اس کے متعلق ایسے بُرے

---

[1] حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ان تعلقات کو واقعات کی روشنی میں دکھایا ہے۔ من شاء فلیراجع الیہ [2] علامہ شعرانی نے اپنے طبقات میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

[3] ایک سے زائد تاریخوں میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

پکاتے ہو۔ فرات کے کنارے تو (العیاذ باللہ) وہ یزید کی دولت کو دیکھ کر آیا تھا۔ لیکن مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ پچیس دفعہ پیادہ پا کس غرض کو سامنے رکھ کر آتا رہا۔ اس کا کیا منصوبہ تھا۔ جب اس نے اپنی ساری جائیداد کو تین دفعہ اللہ کی راہ میں لٹا دیا۔

شاہی طاقت پہلے جسموں کو جھکاتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ اس کا دباؤ عقل پر پڑتا ہے۔ عقلی ریودگی کے ساتھ ہی وہ بھی جھک جاتا ہے جس کے جھک جانے کے بعد ہر چیز جھک جاتی ہے۔ آخر جب دل ہی جھک جائے۔ تو اب آدمی میں کونسی چیز باقی رہ جاتی ہے۔ جو نہ جھکے۔ جذبات، ارادت، خیالات، حرکات و سکنات سب کے سب ان سیاسی بازیگروں کی انگلیوں پر ناچتے ہیں۔ جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ہوتی ہے "انسانیت" کے لئے سب سے بڑی مصیبت اس وقت ہوتی ہے جب ان بازیگروں کے باطن میں خبث و شرارت کے عناصر غالب ہوتے ہیں کہ اس وقت صرف وہی خبیث نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ ساری روحیں جو ان کے سیاسی پنجوں میں گرفتاری ہوتی ہیں۔ سب کی سب گندی اور ناپاک ہو جاتی ہیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خون کے فوارے بہا کر انسانوں کی ایک جماعت تیار کی تھی۔ جن کے پاس صاف سینہ پاک روح منور نفس سلیم قلب، عمیق علم مستقیم عقل کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہ ایسی پختہ، ٹھوس، مستحکم، غیر متزلزل جماعت تیار ہوئی تھی۔ کہ اس کے بعد

یہ توقع بے محل نہ تھی۔ کہ جو نسلیں ان سے نکلیں گی۔ ان میں ان کمالات وفضائل کے جواہر قیامت تک چمکتے رہیں گے۔ کہ یکایک امیہ کے گھرانے میں وہ بچہ پیدا ہوا جس نے اجسام کو قابو میں لاکر عقلوں پر قبضہ جمایا اور بالآخر یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں قلوب و ارواح بھی۔ نبوت کبریٰ کے قائم کئے ہوئے مرکز ثقل سے ہٹ نہ جائیں۔ اور اندیشہ کیا کہ جب ان میں ابن زیاد، عمر دبن سعد شمر پیدا ہو چکے تھے۔ تو کیا اس کے بعد بھی ہم اس کو فقط اندیشہ ہی سے تعبیر کرتے رہیں گے! کیسا خطرناک وقت، کتنی سخت محنت ہے۔ کہ درخت کی شاخوں کو نہیں بلکہ اس کی جڑوں کے ہل جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ کیا کیا جاتا؟ ایسے وقت میں کیا کیا جاتا کیا یزید کی گردن اڑا دینے سے یزید مر جاتا؟ یزید مر جاتا۔ لیکن اس کی روح کس طرح مرتی۔ جس کا وزن امت کے دل و دماغ پر پڑ رہا تھا۔ یہ خدا کی سجائی ہوئی حکمت تھی کہ مسلمانوں میں جو سب سے بڑا تھا، ان میں سب سے زیادہ ذی اثر، با اقتدار تھا۔ ان سب سے زیادہ پیارا محبوب تھا۔ وہ فاطمہؓ کے حجرہ سے نکلا۔ اور بجائے یزید کے خود اپنے گلوئے مبارک پر خنجر چلوا دیا۔ سر مبارک تن سے کیا علیحدہ ہوا کہ مسلمانوں کے مسخر قلوب۔ ان کی مسحور عقلیں۔ ان کا سویا ہوا دماغ یکایک یزید کے عقلی اور ذہنی دباؤ سے علیحدہ ہو گیا۔ بظاہر یزید زندہ رہا لیکن عارفوں نے دیکھا کہ اس کی روح مر گئی۔ اور یہی مقصد بھی تھا نانا کی دیوار کو کون سنبھالتا؟ حسین نہ سنبھالتے۔ تو پھر کس کا زہرہ

تھا کہ اس میدان میں اترتا۔ اور خود اپنے خون سے اس دیوار کی ہلی ہوئی چٹانوں کو پھر مضبوطی کے ساتھ جما دیتا۔ حاجی محمد علی سچ فرماتے ہیں۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

جب یزید کی روح زندہ تھی۔ تو اس سے کوفیوں کی فوج پیدا ہوئی۔ جب حسین علیہ السلام کو حیات جاوید بخشا گیا۔ تو دیکھو اسی کوفہ سے ابراہیم نخعی۔ حماد ابو حنیفہ شعبی جیسے اکابر و رو حانیین نکلتے چلے آتے ہیں۔ اور صرف کوفہ کیا۔ کربلا کے بعد جو بھی آئے۔ اور جہاں تک بھی آئے۔ جس شان میں بھی آئے جنید بن کر آئے یا شافعی۔ امام مالک کی شکل میں نمودار ہوئے۔ یا سفیان ثوری کے لباس میں۔ یہ سب اسی زندہ روح کی ہمت مردانہ کا نتیجہ تھا۔

امام کی عظمت کون پیدا کر سکتا ہے۔ اس بلند مینار پر کون قدم جما سکتا ہے۔ جس پر حسین علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے۔ ایسی ہمہ گیری ہر دلعزیزی کس کے حصہ میں آسکتی ہے۔ کہ جس کا انتقام دنیا صدیوں سے لے رہی ہے۔ اور اب تک انتقام پورا نہیں ہوا ہے۔ قرنوں سے نفرت کی موسلا دھار بارش یزید اور اس کے ساتھیوں پر ہو رہی ہے لیکن تشنگی نہیں بجھتی۔ جس طرح پہلی صدی ہجری میں اس کے اعمال سے لوگوں نے بیزاری ظاہر کی۔ آج تک وہ بیزاری اسی آن بان کے ساتھ

قائم ہے۔ کتنا گہرا کتنا پختہ رنگ اے خون حسین علیہ السلام تو نے پیدا کیا۔ فرضی اللہ عنک واصحابک۔ امت مرحومہ یوں تو آپ کے گھرانے کے فیوض و برکات میں از سرتا بہ قدم غرق ہے۔ اور رہیگی۔ لیکن ان احسانوں میں کتنا بڑا احسان ہے۔ جو آپ نے ہم بیکسوں کے ساتھ کیا۔ اگرچہ آپ نبی نہیں ہیں۔ لیکن نبی زادے ہیں۔ اور اسی لئے آپ سے وہ کام بن آیا۔ جو الوالعزم من الرسل کے شایانِ شان ہے۔ فجزے اللہ عنا وعن المسلمین خیر الجزاء۔"

آج اسلام کا جہاز پھر اسی گرداب میں آپھنسا ہے۔ پھر مسلمانوں کے اجسام اور اجسام کے بعد عقول، عقول کے ساتھ قلوب غیر اسلامی اثرات کے نیچے دبے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ایسا کون یا اثر ہے۔ اتنا اقتدار کس کو حاصل ہے، جو اپنے سر کو علیحدہ کرا کے قلوب کو بھی ان سے علیحدہ کرے؟ اٹھے گا، فاطمہ رض کے گھرانے سے کوئی اٹھے گا۔ روحیں اجنبی دباؤ کے پنجے میں اب زیادہ دیر تک نہ پھڑ پھڑائیں گی۔ قلوب غیروں کے وزن کو اب شاید زیادہ مدت تک نہ محسوس کر سکیں گے عقول کفر کی راہوں میں اپنے لئے روشنی نہ تلاش کریں گی۔ فتربصوا انا معکم من المتربصین!

میں اور بھی کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن جو کچھ دل میں ہو۔ کیا زبان یا قلم پر آنا ضروری ہے؟ ہزار نکتۂ باریک تر زمو اینجاست۔ بعض

باتیں عام کی جاتی ہیں۔ اور بعضوں کے لئے صرف اہل کی ضرورت ہے نفع اٹھانے والوں کے لئے اس میں بھی جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ کم نہیں۔ واللہ یقول الحق وہو یہدی السبیل۔

از :-

قائد ملت نواب بہادر یار جنگ بہادر

اعلی اللہ مقامہ

لسان الامت حضرت قائد ملت علیہ الرحمہ کا وہ خطبہ صدارت جو
آپ نے سیزدہ صد سالہ یادگار حسینی کے موقع پر اس کے اجلاس سوم کے
صدر کی حیثیت سے دیا تھا۔

حادثہ کربلا کا تاریخی پس منظر

ادیان عالم میں شریعت محمدیہ کو ایک نمایاں اور واضح خصوصیت حاصل ہے۔ انسانی دائرہ فکر و عمل کی وسعت و ترقی نے محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد رسالت کو اپنے موقف تک پہنچا دیا تھا کہ دین کا صحیح اور حقیقی مفہوم اپنی کامل اور ناقابل تغییر صورت میں دنیا پر واضح کر دیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت محمدی ایک جہاں ایک طرف ہم کو خالق موجودات سے قریب تر اور وابستہ تر بنانے کا آسان ترین ذریعہ نظر آتی ہے۔ وہیں انسانی مدنی و اجتماعی حیات کیلئے ایک آخری اور ناقابل تغیر نظام و ضابطہ پیش کرتی ہے۔ اس شریعت

میں ہم مذہب کو عیسائیت اور بدھ مت کی طرح اپنے معبود کے ساتھ صرف روحانی تعلق کے پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں پاتے، بلکہ اس کے ضوابط میں ایک فرد انسانی کے دوسرے فرد انسانی کے ساتھ ایک قبیلے کے دوسرے قبیلہ کے ساتھ۔ ایک قوم کے دوسری قوم کے ساتھ۔ ایک ملک کے دوسرے ملک کے ساتھ تعلقات کا مکمل نظام بھی پاتے ہیں۔ اسلام نے اپنے اس اجتماعی نظام کی ابتداء عبادات سے کی۔ اور انتہا نظام حکومت پر ہوئی۔ اسلام کی بتائی ہوئی نمازوں اور اس کے فرض کئے ہوئے روزوں نے جہاں قلب و روح انسانی کو مرضات الٰہی میں فنا ہونے کا درس دیا وہیں اس کے حج اور اس کی زکوٰۃ کے فرائض میں ساری دنیا کے انسانوں کو ایک عالمگیر نظام اجتماعی میں منسلک کر کے ان کی زندگی کو ایک کامیاب زندگی بنانے اور خدا کی خلافت کے منشا حقیقی کو مکمل کرنے کا سامان بہم پہونچا دیا گیا ہے۔ غرض ہم اپنے نظام حیات کے کسی گوشہ کو مذہبی نور ہدایت سے محروم اور تاریک نہیں پاتے۔

اسلام کی تعلیمات کا یہی وہ پہلو ہے۔ جو اسلام کو تمام ادیان عالم میں ممتاز حیثیت عطا کرتا ہے۔ لیکن کوتاہ بین نگاہیں اسی مقام پر پہونچ کر ٹھوکریں کھاتی ہیں۔ اور افضل الانبیا خیر البشر رحمۃ اللعالمین صلوٰۃ اللہ علیہ کی حیات مقدسہ پر اس اعتراض کی

جراءت کرتی ہیں کہ (نعوذ باللہ) حضرت ختمی مرتبت کا مقصد حیات اپنے لئے دنیوی حکومت و جاہ کی تلاش تھا۔ جس کے لئے دنیا کے اس مقدس ترین بزرگ نے نبوت و رسالت کا ڈھونگ رچایا تھا۔ باسورتھ اسمتھ اور کارلائل جیسے مستشرقین کی نام نہاد اسلام نواز تصانیف کا بغور مطالعہ کرنے والا بالآخر اسی نتیجہ پر پہونچتا ہے میں ان مستشرقین کو اس لئے قابل معافی تصور کرتا ہوں کہ ان کے نزدیک عیسائیت کے مسلسل مطالعہ کی وجہ سے مذہب کا تصور ہی غلط تھا۔ وہ مذہب میں انسان کی اجتماعی اور مدنی زندگی کے لئے کوئی مقام ہی نہیں پاتے تھے اور ان کو حیرت ہوتی تھی کہ ایک شخص جو دعوے رسالت ہاتھ میں رکھتا ہو۔ اور تاج نبوت سے سرفراز ہو۔ اس کو انسانی حیات دنیوی کے اجتماعی پہلو سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ وہ اگر تھوڑا غور کرتے۔ تو ان کی سمجھ میں آجاتا کہ اُخروی نجات و فلاح کا انحصار تمام ادیان عالم کی تعلیمات میں بالاتفاق دنیوی حیات کی کامیابی پر ہے۔ اور تمام مفکرین عالم کے نزدیک انسان فطرتاً مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ اس لئے اس کی دنیوی زندگی کی ہیئت اجتماعی کی کامرانی کے بغیر کامیاب ہو ہی نہیں سکتی۔ لہذا وہ مذہب ناکام ناقص اور ترقی یافتہ انسانی جماعت کے لئے ناقابل قبول ہوتا۔ جو انفرادی حیات کو تو سنوار رہا ہو۔ اور اپنے اندر اجتماعی حیات انسانی کے لئے کوئی آئین نہ رکھتا ہو

اگر انھوں نے خاتم النبین صلی اللہ وسلم کی حیات طیبہ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا ہوتا۔ تو ان کو محسوس ہو جاتا کہ ایک ایسی ہستی جس نے تمام عمر غیروں کی اصلاح میں صرف کردی۔ اور قدرت حاصل کرنے کے بعد تعیشات دنیا سے کوئی واسطہ نہ رکھا۔ جس کو اپنے رہنے کے لئے پھونس کے جھونپڑے کے سوا پختہ مکان۔ بیٹھنے کے لئے کھجور کے پتوں کی کھردری چٹائی کے نرم بستر اور کھانے کے لئے نان شعیر کے سوا کوئی اچھی غذا زندگی بھر میسر نہ ہوئی۔ جس نے مال غنیمت کے ڈھیر لٹائے ہوں۔ لیکن جس بیویاں اپنے ہاتھ سے روٹی پکاتی ہوں۔ اور جس کی بیٹی اپنے ہاتھوں سے آٹا پیستی اور اپنے نازک شانوں پر پانی کی مشکیں ڈھوتی ہو۔ اس پر اعتباری حکومت پسندی اور ذلیل دنیوی جاہ طلبی کا الزام عقل سے محروم اور حقائق سے چشم پوشی کی بدترین مثال ہے۔ نہیں انکار کرسکتا ہوں۔ اور نہ کسی سچے مسلمان کو انکار کی جرأت ہو سکتی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مکمل نظام حکومت کی بنیاد رکھی۔ لیکن اس نظام حکومت میں دنیا کے فرسودہ تصورات حکومت اور تاریخ کے ملعون و مردود تصورات فوقیت و برتری کا کوئی مقام نہ تھا۔ محمد عربی کا پیش کردہ نظام حکومت وہ خلافت الہیہ تھی جو منشاء آفرینش انسانی ہے انی جاعل فی الارض خلیفہ جس کا مقصد حیات انسانی میں ایک اجتماعی ہم آہنگی پیدا کرکے اس کو انتشار

خداوندی کے چلانے کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ آیئے ہم اس اسلامی اور محمدی نظامِ حکومت کا سرسری جائزہ لیں۔ تاکہ محمدؐ کے نواسے کی فدویت اور خانوادۂ نبوت کی سرفروشی کا حقیقی راز ہماری سمجھ میں آجائے۔ اور ہم اس یادگاروں کو مناتے ہوئے خود اپنے جادۂ حیات منزلوں کو متعین کر سکیں اور اپنے نشارِ حیات کے صحیح تصور کے ساتھ اپنی زندگی کو محمدؐ و آلِ محمدؐ کے غلاموں کی زندگی بنا سکیں۔

حکومت کا اسلامی تصوّر

مجھے اجازت دیجئے کہ حکومت و سیاست کے ان تصورات کو سرسری طور پر تمہیداً آپ کے سامنے پیش کروں۔ جو آجکل ہر ایک متعلم سیاست کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ تاکہ آپ کو ان کے سامنے اسلامی تصور حکومت کا صحیح زاویہ نگاہ سے مطالعہ کر سکیں ظاہر ہے کہ حکومت کے دو نمایاں اور واضح فرائض ہیں۔ ایک اپنے اندرونی نظام کو اپنے منظور کردہ آئین و ضوابط کے مطابق چلانا اور باشندگانِ مملکت میں امن و ہم آہنگی قائم کرنا اور ان کے تمام جائز حقوق کی حفاظت کرنا۔ دوسرے اپنی مملکت کو اس طرح مضبوط اور قومی بنانا کہ وہ دوسروں کی دست و بُرد و استیلاء سے محفوظ اور آزادی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکے۔ کوئی حکومت اپنے پہلے جزو کی تکمیل نہیں کر سکتی جب تک وہ اپنے لئے کچھ قوانین و ضوابط نہ رکھتی ہو، اس کے

ہاں ایک ایسی جماعت موجود نہ ہو۔ جو ان ضوابط و آئین کے مطابق حکومت کی مشینری کو چلائے اور نظم و نسق کو برقرار رکھے۔ اور دوسری طرف باشندگان مملکت کے حقوق کی حفاظت کرے اور ان کے نزاعات و خصومات کا تصفیہ کرے۔ منتظمین سیاست انھیں سہ گونہ لوازمہ ہائے حکومت کی تکمیل کے لئے تین عوامل کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ایک ایسی جماعت جس کا کام قانون سازی ہو۔ دوسری وہ جماعت جو ان قوانین کو نافذ کرے۔ تیسرا وہ گروہ جو فصل خصومات اور باشندگان مملکت کے تحفظ حقوق کا فرض انجام دے ان کو ہم اپنی اصطلاح میں مقننہ عدلیہ اور عاملہ کہتے ہیں۔ آج دنیا کی ساری سیاسی کشمکش نہیں سہ گونہ اجزائے حکومت کی اصطلاح اور ان کو مختلف النیاتی گروہوں کے نشاء کے مطابق چلانے کیلئے ہے۔ انسان نے جو ترقی کی تو اس نے بزعم خود غلط یہ سمجھ لیا کہ اپنے نظام اجتماعی کو وہ کسی مافوق الانسان ہدایت و رہبری کے بغیر بآسانی چلا سکتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی خصوصیت یہی ہے کہ اس نے انسانی زندگی کے ہر گوشہ کو انسانی ہدایت کا محتاج قرار دیا۔ اور انسان کے لئے اس کے عمل کے فرض و احتیاط کو محفوظ کرتے ہوئے قانون سازی کا منبع صرف خدائے قدوس کی ذات بزرگ و برتر کو یقین کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں نور افشاں اور جلوہ پاش کرتے ہیں۔ اصول و ضوابط و قوانین حیات کی تدوین رب العزت...

نے بنفس نفیس قرآن کے ذریعہ کی اور آج ہمارا صرف ایک ہی فرض رہ گیا ہے۔ کہ ان طرف ان کی تعمیل کریں۔ اور دوسری طرف اپنی زندگی کی مبنی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے اپنی اصول کے تحت تفصیلی قواعد مرتب کریں۔

عہد رسالت میں حکومت کی ہیئت ترکیبی

حضرت نبیؐ مرتب نے جس حکومت کی بنیاد رکھی وہ انہی قوانین الٰہیہ و ضوابط قرآنیہ پر قائم تھی۔ اور اس کی عاملہ و عدلیہ کا فرض ان بزرگ ترین ہستیوں پر عاید ہوتا تھا۔ جن کو ملت اسلامیہ ان ضوابط کے سمجھنے اور ان کے جاری کرنے کی اہل تصور کرے اور ان کی اطاعت کا عہد کرتے ہوئے اپنے آپ کو ان کے مطابق شریعت کے احکام کے تابع بنائے۔ اسلامی نظام حکومت میں خلافت رسول یا اجرائے احکام الٰہیہ کا منصب صرف انہیں ذوات قدسیہ کو حاصل ہو سکتا تھا۔ جنھوں نے مشکوٰۃ نبوت سے کماحقہٗ اکتساب نور کیا ہو۔ اور علوم قرآنیہ کی مہارت تامہ رکھتے ہوں۔ صرف معارف اسلامیہ کی واقفیت کسی شخص کو مفترض الطاعت نہیں بنا سکتی تھی۔ جب تک خود اس کی زندگی کا ہر گوشہ عملاً ان احکام اور تعلیمات کا مظہر نہ ہو کوئی ایسا شخص جو قرآن کے استفہام لما تقولون ما لا تفعلون کا مخاطب ہو سکے۔ امارت مسلمین کے منصب عالی کا مستحق نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ وابستگان دامن نبوت

کسی ایسے شخص کے ہاتھ پر بیعت، اطاعت و انقیاد کو گوارا نہ کر سکتے تھے جس کی زندگی کا ایک ایک گوشہ اس کو سچا اور پکا مسلمان ثابت نہ کر رہا ہو۔ ریاست و حکومت کے وہ تمام تصورات پارینہ جو سنت شداد و فرعون تھے۔ پاش پاش ہو چکے تھے۔ اسلامی نظام حکومت میں امیر ملت کا وہ خادم تھا جس کو حکومت بلا طلب ملت کی طرف سے عطا ہوتی تھی۔ اور جب حاصل ہو جاتی۔ تو اس کا سر اعزاز و افتخار سے بلند ہونے کے بجائے ذمہ داریوں کے بوجھ سے ہر وقت جھکا ہوا جس کو ملت کے خزانہ سے صرف اس قدر حاصل کرنے کا حق تھا جو اس کی قوت لایموت کے لئے کافی ہو۔ اور اس کے متعلقین جن کی پرورش کا وہ ذمہ دار ہے۔ معیشت کی فکر سے آزاد کر سکے۔ نہ اس کے دروازے پر دربان ہوتے تھے۔ نہ اس کے دربار پر نقیب۔ اس کے سرہانے پتھر کا تکیہ ہوتا۔ اور وہ کھجور کی چٹائی کے فرش پر سو کر ایرانی قالین کے بہار کا لطف اٹھا تا تھا۔ اس کی قبائے حکومت ایک گلیم پیوند دار ہوتی۔ اور اس کا تاج سروری ایک عمامہ پارینہ۔ وہ ایوان حکومت میں احکام نافذ کر کے دنیا کے جبابرہ کو لرزہ براندام کرتا تھا۔ تو اس کا سر ندامت ایک بے سہارا بڑھیا کے سامنے اشک آلود آنکھوں کے ساتھ جھک جاتا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت سرکشان عالم کی گردنوں کو خم کرتی۔ تو اس کے دوش کسی بیکس کے گھر کی لکڑیاں ڈھویا کرتے تھے۔ اس کے دربار میں غریب یا

بڑھیا اور ذلیل غلام کو بھی حرف گیری و نکتہ چینی کا حق ہوتا تھا۔ اور وہ اپنے فرائض کو کما حقہٗ ادا کر کے بھی دامن شب کو اپنے پیارے آنسوؤں سے تر کرتا تھا۔ اور خدا کے عذاب سے ڈرتا تھا۔

یہ اسلامی نظام اجتماعی محمد رسول اللہ کا وہ عطیہ اور خدا کی وہ امانت تھی۔ جس کی حفاظت یوں تو محمدؐ کو رسول اللہ سمجھنے والے ہر متنفس پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن جن کی نسبتیں محمد سے قریب تر اور مضبوط تر تھیں۔ وہ اس فرض کو عظیم تر سمجھنے پر مجبور تھے۔ دنیا کی تاریخ ہمیشہ اس واقعہ کو افتخار کے ساتھ بیان کرتی رہے گی۔ جس کے نتیجہ کے طور پر محمد الرسول اللہ کے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہٗ کی زبان حق شناس سے "لولا علی لہلک عمر" کے الفاظ نکلے۔ اور جبکہ محمد رسول اللہ کے ایک فرض شناس اور نور قرآنی سے اپنے قلب و روح کو منور رکھنے والے مقرب نے خلیفہ کے وقت کے فیصلہ میں سہو کو برداشت نہ کیا۔ اور بلا اندیشہ وسواس اس کو ظاہر کر کے ترمیم کرا دی۔

زمانہ گذر گیا۔ ممالک فتح ہوتے گئے

خلافت راشدہ کے بعد

اسلامی تعلیمات کو قبول کرنیوالے دنیائے معلوم کے ایک ایک گوشہ میں پھیلتے گئے۔ عیسائیت۔ یہودیت و مجوسیت سے اسلام کی طرف رجوع کرنیوالوں نے اپنے تصورات قدیمہ کو اسلام میں داخل کرنا شروع کیا۔ احکام الٰہیہ پر مصالح وقت کو

غلبہ حاصل ہوتا گیا۔ انسانی رائے مذہب میں مقام پیدا کرتی گئی
خدا چھپنے لگا۔ نفس ابھرتا گیا۔ اور اسلامی تصور حکومت میں رفتہ رفتہ
قیصریت و کسرائیت کی بو آنے لگی۔ محمد ﷺ کی جانشینی کا معیار اہلیت
کی بجائے وراثت بننے لگا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں روحِ محمد
بیچین نظر آئی۔ اور کسی کی رگوں میں خونِ محمد کھولنے لگا۔ اور امانت
محمدی کی حفاظت کے لئے آلِ محمد برسرِ دار نظر آنے لگے۔

فتنۂ وراثت حضرت علی اسد اللہ الغالب کرم اللہ وجہہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت اور امام حسن
رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت
سے دست برداری کے بعد خلافت کی نسبت تمام جھگڑوں نے
اس وقت کے عالم اسلامی کو تہ و بالا کر رکھا تھا، ختم ہو چکے تھے
حضرت معاویہ نے اپنے پیش روؤں کے طرز پر حکومت اسلامیہ
کے نظام کو چلانا شروع کیا۔ گو اس میں ایران و روم کی سطوت و جبروت
دنیوی کی جھلک پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اساس اسلامی متزلزل نہ ہوئی
تھی حضرت معاویہ ان اختلافات سے قطع نظر جو حضرت عثمان رضی
اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے
درمیان پیدا ہو گئے تھے۔ بہرحال فیض یافتہ دبستانِ نبوت تھے
اور تعلیمات قرآنی سے کاتب وحی کی حیثیت میں بھی واقفیت رکھتے
تھے۔ خود حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا ان کی خلافت پر بیعت کرنا اس امر

اجماعِ امت کے اتفاق کی آخری مہر تھی۔ سارے اصحاب رسول نے
ان کی خلافت و امارت کو قبول کیا۔ اور اسلامی فتوحات کا سلسلہ بھی
جاری ہو گیا۔ مجھ جیسے ہیچ میرز کو سزاوار نہیں کہ ایک صحابیٔ
رسول پر خردہ گیری کروں۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کو
نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اسلامی نظام حکومت میں بنیادی اور
اصولی طور پر فتنہ کی بنیاد اس وقت اور صرف اس وقت پڑی
جبکہ حضرت معاویہ نے خلافت کو الہی اور موروثی بنانا چاہا ان
کے سامنے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ اسوۂ حسنہ موجود
تھا کہ جب وہ اس دنیا سے کوچ کرنے لگے ہیں۔ اور ابو لولو کے
پہنچائے زخم ان کے آخری لمحاتِ حیات کو قریب تر کرتے جا رہے
ہیں۔ لیکن ملت مرحومہ کے مستقبل کے تصور نے ان کے سارے
جسمانی کرب کو فراموش کر دیا ہے۔ اور جانشین محمد رسول اللہ کا انتخاب
ان کے پیش نظر ہے۔ اس وقت کسی نے ان کے سامنے ان کے
فرزند عبداللہ کا نام لیا۔ ان عبداللہ کا نام جو بدر کے معرکہ آراؤں
میں شریک تھے۔ جو اتباع سنت رسول اللہ میں خود صحابہ کے نزدیک
سند تصور کئے جاتے تھے جن کا علم قرآن مسلم تھا۔ اور جن کے تقویٰ
کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔ ان کا نام جب خاتم النبین کی خلافت کے لئے
پیش ہوتا ہے۔ جو حضرت عمرؓ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو جاتا ہے۔ اور آپ
بستر مرگ پر تڑپ جاتے ہیں۔ کاش حضرت معاویہ نے اپنی زندگی

میں اصحاب رسول کو جمع کر کے اپنے عہد کے بہترین شخص کو تلاش کر لیا ہوتا۔ افسوس ان کی فراست اجتماعی کو لغزش ہوئی۔ اور ولی عہدی کے لئے یزید کے انتخاب نے اسلامی اصول اجتماعی کی بنیاد ہلا دی۔ کیسے ممکن تھا کہ رسول کا نواسہ اور وارث ان تعلیمات نبوی کا مزاج دنیا میں موجود تھا۔ اور وہ اس چیز کو برداشت کر لیتا۔ دنیوی حیثیت سے وہ بے سہارا تھا۔ افواج یا عساکر اس کے زیر کمان نہ تھے۔ تاج و تخت پر اس کو اقتدار حاصل نہ تھا۔ لیکن اس کے قلب میں قرآن تھا۔ اس کی نگاہوں میں ایمان کا نور تھا۔ اور اس کی زبان پر لا الہ الا اللہ کی شہادت تھی۔ اس کا سر اس کے قبضہ میں تھا۔ وہ اس کے کٹا دینے پر قدرت رکھتا تھا۔ لیکن اس کا ہاتھ جان بوجھ کر ایسے شخص کی بیعت کے لئے نہ بڑھ سکتا تھا جو قرآن اور حاملِ قرآن کے قائم کئے ہوئے معیار خلافت پر پورا نہ اترتا ہو جس کے ہاتھ میں آکر اگر قوانین الٰہیہ اور احکام الٰہیہ کی روح کے مٹ جانے کا اندیشہ ہو جس کی زندگی خود احکام اسلامی کی آئینہ دار نہ ہو جس کے متعلق مشہور ہو کہ وہ امر کا پابند نہیں اور نواہی سے پرہیز نہیں کرتا۔ حضرت امام حسینؑ۔ (خداوند قدوس کی ساری رحمتیں ان پر نازل ہوں) اپنی کسمپرسی اور بے سروسامانی کے باوجود اس کو برداشت نہ کر سکے۔ اور یہی ان کی شہادت کا پس منظر اور تاریخ عالم کے اس عدیم المثال سانحہ کی علت اصلی ہے۔

شہادت کی حقیقت

حق و باطل کی ستیزہ کاری اس عالم کون و فساد کا قدیم ترین دستور رہا ہے۔ اور اس کی ایک خصوصیت تاریخ کے ہر دور میں نمایاں رہی کہ باطل سارے ساز و سامان کے ساتھ آراستہ رہا ہمیشہ اس کا تخت سیم و زر کے انبار پر قائم ہوا۔ اور ہمیشہ اس کے جلو میں طاقت و جبروت کی فوجیں ہوئیں اور حق تنہا آیا بے زر آیا۔ بے وسیلہ آیا۔ نمرود کے دربار میں آذر کا بیٹا ہو یا فرعون کے حضور میں بنی اسرائیل کا یتیم۔ تم اس خصوصیت کو ہر جگہ نمایاں پاؤ گے۔ مردان حق کی سب سے بڑی طاقت جس نے دولت کے اس ڈھیر کو خاکستر بنا دیا اور سطوت و جبروت دنیوی کو عہن منفوش بنا دیا۔ وہ ان کی لازوال استقامت اور بے مثال ثبات قدم تھا۔ بسا اوقات داعیان حق دنیائے اعتبار کے نزدیک شکست خوردہ وہ ناکام ہوئے۔ لیکن ان کی ہر شکست میں ایک تعمیر اور ان کی ہر ناکامی میں ایک کامیابی مستتر رہی۔ وہ خود مٹ گئے۔ لیکن عقل و خرد کی دنیا کو بنا گئے۔ وہ خود پاش پاش ہو گئے۔ لیکن اپنے بعد اصول کا ایک فنا نہ ہونے والا نشان چھوڑ گئے۔ دنیا نے جب کبھی اپنی تعمیر کا مقصد کیا۔ انھیں کے خرابوں پر اپنی بنیاد رکھی اور انہیں کے نشان قدم کو اپنے لئے مشعل راہ بنا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ شہادت نگاہ ظاہر بیں کے لئے موت۔ لیکن قلب حقیقت شناس

کے لئے حیاتِ ابدی تصور کی گئی۔ "ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولٰکن لا تشعرون" راہ حق میں مرنے والے کو شہید اس لئے کہتے ہیں کہ جب وہ اپنی دنیوی سعی و عمل میں ناکام ہو جاتا ہے۔ اور فقدان اسباب دنیوی کے باعث اہل باطل سے اپنے آپ کو منوا نہیں سکتا۔ زمانہ کو اپنے لئے ناسازگار پاتا ہے۔ اور اہل زمانہ کو اپنے ساتھ نہیں لے سکتا۔ تو رحمت الٰہی سے مایوس نہ ہونے والا حق پرست امروز کو چھوڑ کر فردا کی فکر کرنے لگتا ہے۔ اور جب اس کے قدم حدود اللہ کی انتہا پر پہنچ جاتے ہیں۔ تو باطل کی سرحد میں پاؤں رکھنے کی بجائے وہ اپنے خونِ سرخ و گرم کی ایک واضح نمایاں اور نہ مٹنے والی لکیر حق و باطل کے درمیان کھینچ دیتا ہے۔ تاکہ پیچھے آنیوالے رہ نوردانِ حق اس کو دیکھ کر اپنی منزل کا پتہ لگا لیں۔ اور اس کا خون چمکتا ہوا اور باطل کی نگاہوں کو خیرہ کرتا ہوا خون، نظر نہ آنے اور محسوس ہونے والا خون قیامت تک باطل سے انکار اور حق کی اتباع میں شہادت دیتا رہے۔ ان کی یہی شہادت و گواہی و حیاتِ جاوید ہے جو جریدہ عالم پر ان کے دوام کو ثبت کر دیتی ہے۔ دنیا مٹ جاتی ہے لیکن وہ نہیں مٹتے۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

اسرارِ شہادت حسینؑ

امام حسین علیہ السلام یزید کے مقابلہ میں اعتباری فتح حاصل نہ کر سکے عمروابن سعد کی فوجوں کو شکست نہ دے سکے۔ شمر باطل پرست کے خنجر کو نہ روک سکے۔ کوفہ اور دمشق کو ان کی فوجوں سے سر نہیں کیا۔ انھوں نے اپنا سب کچھ اپنے ہاتھوں کربلا کے میدان میں لٹادیا اپنے جوان اور ہم شبیہ رسول بیٹے کی نعش کو اپنی آنکھوں کے سامنے تپتی ہوئی سرزمین پر تڑپتے دیکھا۔ اپنی آغوش میں مسکراتے ہوئے علی اصغر کو دم توڑتے برداشت کیا۔ اپنے بھائی کی امانت قاسم جانباز کو اپنی زبان سے میدان جنگ کی اجازت دیدی تھی۔ اپنی بہن کو اور زینبؓ جیسی بہن کو اپنی مرضی سے جگر کے ٹکڑوں کا داغ برداشت کرنے پر مجبور کیا عباس جیسے بھائی کی مفارقت کی پرواہ نہ کی۔ اور سب سے آخر میں اپنے بیمار بیٹے۔ اپنی نازوں کی پلی بیوی۔ اپنی ماں جائی بہن۔ اپنی عزیز جان بیٹی۔ اور اپنے سارے خاندان کو دشت کربلا میں بے کس و بے سہارا چھوڑ کر راہ حق میں اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ لیکن جانتے تھے کہ اپنے فرض کو پورا کر رہے ہیں۔ اور اپنے خون کو اپنے نانا کی امت کے لئے تلاش حق کی ہر منزل میں نشانِ راہ بنا رہے ہیں ان کی یہی ایثار۔ ان کی یہی قربانی اور ان کی یہی فدیت آج دنیا کے ہر گوشہ میں بسنے والے مسلمان کو ہر سال ان کی یاد منانے پر مجبور کر رہی ہے۔ امام حسین علیہ السلام جانتے تھے کہ الا للہ

کی بنیاد لا الہ پر قائم ہے اسلام باطل کی نفی سے شروع ہوتا ہے۔ اور حق کے اثبات پر مکمل ہوتا ہے مسلمان اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا۔ جب تک ان سب اقتدار پسندوں کی نفی نہ کر دے۔ جو خدا کے سوا ہے اور اس کے بنائے ہوئے ضوابط کے خلاف اپنے اندر اقتدار دیکھنا چاہتے ہیں۔ مسلمان الا اللہ کے راستے میں مٹ سکتا ہے لیکن لا الہ سے روکا نہیں جا سکتا۔ کربلا کے اس یادگار واقعہ میں فی الحقیقت اسلام کی اسی بنیادی اور اساسی تعلیم کی تلقین پوشیدہ ہے اور یہی وہ مقام ہے۔ جہاں پہنچکر کسی کی حقیقت شناس نگاہوں نے دیکھا اور حق پاسش نگاہ چلا اٹھی کہ ۔

خدا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

ابتدائے آفرینش سے قانون فطرت یہی رہا ہے کہ خدا کی ربوبیت نے جب کبھی انسان کی تربیت روحانی کا قصد فرمایا۔ اور اس کو صراط مستقیم دکھانا چاہی۔ تو انہی میں سے اپنے ایسے بندوں کو منتخب کر لیا۔ جو ان کو اپنے پیام و عمل کے ذریعہ خدا سے قریب تر کر سکیں۔ ان مردان حق کا سب سے پہلا کام یہی رہا کہ الا اللہ کا درس دینے سے پہلے انھوں نے لا الہ کی تلقین کی۔ اور نہ صرف تیشۂ لا الہ سے سیم و زر اور سنگ و آہن کے بتان

محسوس کو توڑا۔ بلکہ قلوب کی دنیا سے ان بتانِ غیر محسوس کی بیخ کنی کی، جو خدا گریز تصورات کی صورت میں جا گزیں ہو چکے تھے۔ ابراہیم خلیل کے لئے بت خانہ آذری مسمار کرنا آسان تھا۔ لیکن قلب نمرود کو بدلنا مشکل اعصائے موسیٰ ساحران مصر کے دہشت انگیز جادو کو تو فنا کر سکتا تھا۔ لیکن فرعون سے دعوائے انا ربکم الاعلیٰ کے خبط کو نہ مٹا سکا۔ ابن مریم کے لمس ونظر نے ابرص واعمیٰ کو تو شفا دی۔ اور مردوں کو تو بحکم خدا زندہ کر دیا۔ لیکن احبار یہود اور اکابر روم کی خدا ناشناسی کو دور کرنا آسان نہ تھا۔ خدا گریزی وحق فراموشی کے میدان جنگ کا راستہ آگ کی چِتا قلزم مواج اور صلیب کی میخوں سے ہو کر گذرتا تھا۔ یہ اور ان کے متبع کبھی کامیاب ہوئے۔ اور کبھی نہ ہو سکے لیکن جو نہ ہوئے۔ انھوں نے اس راستے میں اپنے آپ کو فنا کر کے اپنے بعد آنیوالے رہ نوردان راہ لا الہ کے لئے نقش قدم اور نشان چھوڑے۔ آج بھی ہم کبھی حج وقربانی کے ذریعہ اور کبھی آیات قرآنی کو تلاوت کر کے ان کی تگ ودتاز جادۂ حق کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ اپنی زندگی میں ایسے ہی مواقع پیدا ہوں۔ تو ان کے طرز عمل کو اپنا وظیفۂ حیات بنالتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اسوۂ حسنہ کی اتباع ہم پر واجب

کی گئی۔ خاتم النبین محمد الرسول اللہ کی بعثت نے سلسلہ نبوت کو تو ختم کر دیا۔ لیکن نور نبوت سے تنور ہو کر دنیا کی تاریکیوں کو متجلی کرنے والوں کا سلسلہ دشت کربلا سے شروع ہوا۔ اور میدان قیامت تک جاری رہے گا۔ ہمارا سب سے بڑا فرض یہی ہے کہ شپرہ چشم کی طرح نورِ آفتاب سے بے بہرہ رہنے کی بجائے اپنی بصارت کو بصیرت کو اس نور سے منور کریں اور اپنی دنیا کو ان جاں سپاران جادہ حق کی مقصود و معہود دنیا بنانے کی کوشش کریں۔

امت اسلامیہ کیلئے درس عمل

لا الہ الا اللہ کہنے والو! اور اس پر اپنی حیات دنیوی کی بنیاد رکھنے والو! اور اسی کے ذریعے حیات اخروی کی فلاح چاہنے والو! حسین سے محبت کرنے والو! حسین کے لئے رونے والو! اور حسین کی غلامی پہ فخر کرنے والو! اگر حسین کیطرح تمہارا مقصد حیات بھی حکومت اسلامیہ کا قیام نہیں ہے اگر حسین کی طرح تم اصول حکومت اسلامی کی تباہی دیکھ کر تڑپ نہیں سکتے۔ اگر حسین کی طرح تم بھی سر دینے لیکن باطل کی طاقت کے سامنے دست مودت بڑھانے سے انکار کرنے کے لئے تیار نہیں ہو۔ اگر لا الہ کی منزل تم کو دعوت ایثار و قربانی نہیں دے رہی ہے۔ اگر اپنی دنیوی زندگی کا عیش و آرام اپنے آراستہ اور مکمل مکان۔ اپنی دولت کے ڈھیر۔

اپنے بیوی بچے اور عزیز و اقارب اپنے مناصب و جاہ و مراتب تم کو الا اللہ سے زیادہ محبوب ہیں۔ تو اپنے جھوٹے دعوی محبت حسین سے قلب حسین پر خنجر شمر سے تیز تر خنجر نہ چلاؤ۔ اگر تمہاری پیشانی زیر خنجر بھی صرف خدائے واحد و قہار کے لئے سجدہ ریز نہیں ہو سکتی۔ اگر تم راہ حق میں بھی سب کچھ لٹا کر مسکرا نہیں سکتے۔ اگر تم ظالم کے گھوڑے کی ٹاپوں میں روندے جا کر بھی سبحان ربی الاعلیٰ نہیں پکار سکتے۔ اگر تم محمد رسول اللہ کی امانت یعنی تعلیمات قرآنی کو دنیا سے مٹتا ہوا دیکھ کر بھی برداشت کر سکتے ہو۔ خدا کا واسطہ محمد رسول اللہ کا واسطہ اور خون شہید کربلا کا واسطہ اپنی نسبتوں کو دامن حسین سے وابستہ کر کے اس کو آلودہ نہ کرو۔ محرم کا چاند ہر سال افق مغرب سے طلوع ہوتا ہے اور اپنی پتلی پتلی نازک انگلیوں سے کربلا کے میدان کی طرف اشارہ کرتا اور مسلمانوں کو یاد دلاتا ہے۔ کہ راہ حق میں فدویت اس کی زندگی کی منزل ہے۔ یزید دنیا سے مٹ نہیں گئے۔ اور کربلا کے دامن نے حسین کو چھپا نہیں لیا۔ ہمیشہ یزید پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اور ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے۔ دنیا کو ہمیشہ حسین کی ضرورت رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ یزید کو دیکھنے کے لئے حسین کی نگاہ درکار اور یزید سے نپٹنے کے لئے حسین کا دل چاہیئے۔ ہر وہ طاقت جو باطل کی علمبردار ہے۔ اور قوانین الٰہی سے

گریز کرنا چاہتی ہے۔ یزیدیت کی مظہر اور ہر وہ مرد حق پرست جو قوانین الٰہیہ کا نفاذ چاہتا ہے۔ اور حکومت الٰہیہ کا متمنی ہے راہ حسین پر گامزن ہے۔ اگر سیزدہ صد سالہ یادگار کربلا رہ نوردان راہ حسین کے لئے کوس رحیل نہ بنی۔ تو اس پر جو محنت جو روپیہ اور جو وقت صرف ہوا میں اس کو ضائع شدہ سمجھتا ہوں۔

شہادت کی دائمی یادگار

حیات جاوید کے طلبگار و

فرعون اور اس کے ساتھیوں کی نسبت قرآن حکیم نے فرمایا کہ فما بکت علیھم السماء والارض لیکن حسین کی مظلومیت کا ماتم آج دنیا کے ہر گوشہ میں ہو رہا ہے اگر چاہتے ہو کہ اپنے آپ کو بھی زندہ جاوید بنا لو تو اس کا ایک اور صرف ایک راستہ ہے۔ اور وہ راہ حسین ہے ہم ہر روز کئی کئی دفعہ خشوع و خضوع سے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہو کر صراط مستقیم کی دعائیں مانگتے ہیں۔ اور پھر اسی کے بتائے ہوئے الفاظ میں صراط مستقیم کی تشریح کرتے ہیں کہ وہ ان کی راہ ہے۔ جن پر خدا نے انعام کیا۔ اور پھر صاف الفاظ میں اپنے انعام یافتگان کا پتہ دیتا ہے کہ اولٰئک الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین صراط مستقیم یعنی انعمت علیھم کی منزل تک پہنچنے کی تمنا رکھنے والو صراط مستقیم تمہارے راستے میں ہے۔ اور وہ شہدائے کربلا کی راہ ہے۔ میری دلی تمنا

ہے کہ واقعہ کربلا کی یہ یادگار ہمارے احساس فرض کی بیداری کا باعث بنے۔ اور خدا کرے کہ جس دولت کو تباہ ہوتے ہوئے دیکھ کر امام حسین نے دشت کربلا کو لپنے اور اپنے لاڈلوں کے خون سے لالہ زار بنا دیا تھا۔ ہم اس دولت کو ایک مرتبہ پھر پالیں۔ اور ایک مرتبہ پھر ہم دنیا میں قوانین الٰہیہ کو نافذ ہوتا اور حکومت الٰہیہ کو قائم ہوتا ہوا دیکھ سکیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ۔

از:-

مولانا ابوالکلام آزاد

یادِ حسین علیہ السلام

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم
قال اللہ تعالیٰ۔ الحمد للہ رب العالمین
الرحمن الرحیم۔ مالک یوم الدین ایاک
نعبد و ایاک نستعین۔ اھدنا الصراط
المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر
المغضوب علیھم ولا الضالین

✻

شمعہا بردہ ام از صدق بخاک شہدا
تا دل و دیدۂ خونابہ فشانم دادند!

تمہید حادثہ کبریٰ اور شہادت العظمیٰ وقائع و حوادث اسلامیہ کا وہ عظیم الشان واقعہ ہے۔ جو تاریخ اسلام کی اولین صدی سے لے کر اس وقت تک اپنے عجیب

و غریب تاثر ماتم و درد و اور حیرت انگیز بقائے ذکر و تاثیر کے لحاظ سے نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ تمام حوادث محزنہ عالم میں ایک عدیم النظیر امتیاز رکھتا ہے۔ اگر وہ تمام آنسو جمع کیئے جائیں جو سنہ ۶۱ سے لے کر اس وقت تک اس واقعہ جانسوز پر بہا دیئے گئے ہیں اگر وہ تمام درد و آہ و فغان سوزاں کو یکجا کیا جا سکے۔ جو ان تیرہ صدیوں کی لاتعداد لاتحصٰی اسلام نسلوں کی صداہائے ماتم کے ساتھ بلند ہوتا رہا ہے۔ اگر درد و کرب کی وہ تمام چیخیں۔ اضطراب و الم کی وہ تمام پکاریں۔ سوزش و تپش کی وہ تمام بے قراریاں۔ اکٹھی کی جا سکیں جو اس حادثہ کبریٰ کی یاد نے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے اندر ہمیشہ پیدا کی ہیں۔ تو کون کہہ سکتا ہے کہ خونفشانیہائے حسرت کا ایک نیا اوقیانوس سطح ارضی پر موجزن نہ ہو جائے گا؟ درد و آہ و فغاں کی ہزارہا بھٹیاں بھڑک نہ اٹھیں گی۔ اور درد و الم کی چیخوں، حسرت کی صداؤں تڑپ کی بے چینیوں کے ہنگامہ شیون سے تمام عالم ایک شور زار نالہ و بکا نہ بن جائے گا؟

تاہم میں جو پیام فرزندان اسلام تک پہونچانا چاہتا ہوں وہ اس تذکرے سے بالکل مختلف ہے۔ میں غم و الم کی شدت و کثرت کے اعتراف کا تاریخ نہیں ہوں۔ بلکہ اس عدیم النظیر شدت و کثرت کے بعد بھی آنسوؤں کا طالب ہوں۔ آہوں کی صدا ہوں بے قراری کی پکار ہوں۔ اضطراب کی دعوت ہوں۔ اور آہ! آہ!

لئے صد ہزار آہ وحرماں کے غم کے لئے بھوکا ہوں۔ اور درد والم کے لئے یک قلم پیاسا ہوں۔ پس میں آج ان آنکھوں کا تذکرہ نہیں ہوتا۔ جو بہت رو چکی ہیں مجھے ان آنکھوں کا سراغ بتاؤ جو اب بھی رونے کے لئے نم آلود ہیں۔ میں ان دلوں کی سرگذشت نہیں سنتا۔ جو تڑپتے تڑپتے تھک چکے ہیں۔ میں ان دلوں کی تلاش میں نکلا ہوں۔ جو اب بھی تہ و بالا ہونے کے مضطرب ہوں مجھے ان زبانوں سے کیا سروکار جن کو فغاں سنجی ہائے ماضی کا ادعا ہے؟ آہ! میں تو ان زبانوں کے لئے پکار رہا ہوں۔ جن کے اندر غم وماتم کی بھٹیاں سلگ رہی ہیں۔ اور ان کا دھواں آج بھی کائنات نشاط نادانی کی اس تمام فضاء غفلت کو مکدر کر سکتا ہے۔ جس کو عیش وعشرت کے قہقہوں میں درد وعبرت کی ایک آہ بھی نصیب نہیں!

نہ داغ تازہ می خارد۔ نہ زخم کہنہ می کارد
بدہ یارب دلے کیں صورت بیجاں نمی خواہم

ہاں! یہ سچ ہے کہ رونے والے اس پر بہت

دعوت درد

روئے۔ ماتم کرنے والوں نے ماتم میں کمی نہ کی۔ آہ و نالہ کی صداؤں نے ہمیشہ ہنگامۂ الم کی مجلس طرازیاں کیں اور یہ سب کچھ اب تک اتنا ہو چکا ہے۔ جتنا آج تک شاید ہی دنیا کے کسی حادثہ غم کو نصیب ہوا ہو۔ تاہم تم یقین کرو کہ باایں ہمہ اس

حادثہ عظیمہ کی دعوت اشک و حسرت اب تک ختم نہیں ہوئی ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی دعوت درد کے اندر جو حقیقی طلب تھی وہ اب تک لبیک کے سچے استقبال سے محروم ہے۔ تیرہ صدیاں مع اپنے دوران محرم و عشرۂ ماتم کے اس پر گذر چکی ہیں۔ لیکن اب تک خاک کربلا کے وہ ذرات خوں آشام۔ جن کو آج بھی اگر نچوڑا جائے۔ تو خون شہادت کے مقدس قطرے۔ اس سے ٹپک سکتے ہیں بدستور آنسوؤں کے لئے پکار رہے ہیں۔ خوں فشانیوں کے لئے داعی ہیں۔ آہ و فغاں کے لئے تشنہ ہیں۔ اضطراب دل کے لئے بے قرار ہیں۔ اور فضار ریگ زار کرب و بلا کا ایک ایک گوشہ اب تک دیدہ ہائے اشک افشاں جگر ہائے سوختہ دلہائے دو نیم، اور زبان ہائے ماتم سرا کے لئے اسی طرح چشم براہ ہے جس طرح سنہ ۶۱ھ ہجری کی ایک آتش خیز دوپہر میں خون کی ندیوں کی روانی، تڑپتی ہوئی لاشوں کے ہنگامہ احتضار اور ظلم و مظلومی جرح و مجروحی۔ قتل و مقتولی کے ہنگامۂ الیم کے اندر سے نالہ ساز طلب اور فغاں فرمائے دعوت تھا۔

شد ہم خاک و لیکن بوئے تربت ما
تواں شناخت کزیں خاک مرد می خیزد

لیکن اگر یہ دعوت درد محض اس پانی کے لئے ہے۔ جو ندیوں کی جگہ آنکھوں سے بہے۔ اگر یہ طلب غم محض ان صداؤں کیلئے

ہے۔ جن کا غوغا درختوں کے جھنڈ۔ چڑیوں کے گھونسلوں، دریاؤں کے ہیران کی جگہ انسانوں کی زبانوں سے بلند ہو۔ اگر یہ انتظار الم محض اس ماتم کے لئے ہے۔ جو پتھروں کے ٹکرانے کی جگہ انسانی دست وسینہ کی ٹکر سے ہنگامہ ساز ہو۔ تو اے برادران غفلت شعار! وائے چشمان خواب آلود! بلاشبہ یہ سب کچھ ہو چکا اور بلاشبہ سوال کو جواب۔ دعوت لبیک۔ اور طلب کو مطلوب مل چکا۔ اگر انسان کا بچہ بھوک سے روتا۔ اور روٹی کے لئے آنکھوں کو سرخ کر لیتا ہے۔ تو انسانوں کے بڑے بڑے گروہ کیوں نہیں آنسو بہا سکتے؟ اگر درختوں کے جھنڈ ہوا سے ہل کر چند لمحوں کے لئے دنیا کو شور وغوغا سے لبریز کر سکتے ہیں۔ تو آدم کی اولاد اپنی آہ دبکا سے کیوں آسمان کو سر پر نہیں اٹھا سکتی۔؟ اگر بے جان بے روح پتھر دوسرے پتھر پر گر کر رعد وبرق کا ہنگامہ پیدا کر سکتا ہے۔ تو تم کہ روح اور ارادہ رکھتے ہو۔ اپنے دست ہائے ماتم کناں سے کیوں ایک ہنگامہ دار دہشت گرم نہیں کر سکتے۔؟ کیا تم کو دنیا کی ان آنکھوں کی خبر نہیں جو روتی ہیں حالانکہ ان سے ایک آنسو بھی نہیں بہا۔؟ کیا تم نے ان نالوں کے متعلق کچھ نہیں سنا۔ جو چیختی ہیں۔ حالاں کہ انھوں نے ایک چیخ بھی نہ پائی؟ اور کیا تم نے ان جسموں کا تماشہ نہیں دیکھا جو تہہ وبالا ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان کو ایک تڑپ بھی نصیب نہ ہوئی؛

پھر کیا اس غفلت آباد ہستی میں وہ دل بھی نہیں ہیں۔ جو گو دل ہیں۔ مگر دل نہیں ہیں۔ کیونکہ دل کی طرح نہیں سوچتے۔ کیا وہ کان بھی نہیں ھیں۔ جو گو سامع ہیں۔ مگر کان نہیں ہیں۔ کیونکہ نہیں سنتے؟ اور کیا ایسی آنکھیں بھی نہیں ہیں۔ جو گو بصیر ہیں۔ مگر آنکھیں نہیں ہیں۔ کیونکہ نہیں دیکھتیں۔ لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اذان لا یسمعون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا۔ اولٰئک کالانعام بل ھم اضل واولٰئک ھم الغافلون (۷: ۱۷۸)

درد و الم کی یہ پاک دعوتیں صرف اسی روانی آب تسلسل صدا اور ہنگامہ غوغائی ہی کے لئے نہیں ہوتیں۔ جو آنسوؤں، فغاؤں اور نالوں کے نام سے ظہور میں آ جائیں۔ اور اگر ان کا یہی مقصد ہوتا۔ تو اس کے لئے انسان کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ کتنے ہی سمندر پانی سے لبریز ہو رہے ہیں۔ اور کتنے ہی جنگل شور و غوغا سے ہنگامہ زار ہیں۔ بلکہ یہ دعوت۔ یہ پکار۔ یہ طلب "ہل من مجیب" فی الحقیقت ان آنسوؤں کے لئے ہے۔ جو صرف آنکھوں سے نہیں بلکہ دل سے بہتے ہیں۔ وہ ان آہوں کا دھواں مانگتی ہے جو کہ نکلیں صرف منھ ہی سے نہیں بلکہ اعماق قلب سے اٹھیں۔ وہ صرف ماتم ہی کے لئے نہیں پکارتی۔ بلکہ دل کے ماتم کی محض ایک صدائے حقیقت کے لئے تشنہ ہے۔ اگر تمہارے

پاس اس کے لئے آنکھوں کا آنسو نہ ہو تو اسے کوئی شکایت نہیں لیکن آہ تمہاری غفلت۔ اگر تمہارے پہلوؤں میں کوئی زخم نہ ہو۔ جس سے پانی کی جگہ خون بہے۔ اگر تمہاری زبانوں کو درد کی چیخ نہیں آتی۔ تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن آہ یہ کیا ہے۔ کہ تمہارے دلوں کے اندر حقیقت شناسی کی ایک ٹیس۔ عبرت کی ٹیک بصیرت کی ایک تڑپ۔ احساس صحیح و حق کا ایک اضطراب بھی نہیں ہے۔

طوفان نوح لانے سے اے چشم فائدہ!
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

اللہ اللہ سید الشہداء مظلوم کی مظلومی اور یا للعجب غفلت و نادانی کی بو قلمونی!! اس سے بڑھ کر دنیا میں "مظلومی" کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ دشمنوں اور دوستوں۔ دونوں نے اس پر ظلم کیا۔ دشمنوں نے اس کی شہادت عظیمہ کی عظمت مٹانی چاہی۔ مگر دوستوں نے بھی اس کی شہادت کی اصلی حقیقت و بصیرت سے غفلت کی۔ دشمنوں نے اس پر ظلم کیا۔ کیونکہ اس کی مظلومی پر انھیں رونا نہ آیا۔ پر ان دوستوں نے بھی ظلم کیا جو گو روئے۔ مگر اس کی اصلی تقدیس و شرف کے لئے سچائی اور عمل کا ایک آنسو بھی نہ بہا سکے۔ دشمن تو دشمن تھے۔ اس لئے انھوں نے اس کی دعوت حق کو مٹانا چاہا۔ مگر دوست دوست ہو کر بھی

اس کی دعوت کی پیروی نہ کر سکے! وتراھم ینظرون
الیک وھم لا یبصرون (۷-۱۹۸)
پس سچا ماتم وہی ہے۔ جو صرف ہاتھ ہی کا نہیں۔ بلکہ دل
کا ماتم ہو اور دعوت درد کا اصلی جواب وہی ہے۔ جو عبرت
وبصیرت کی زبان سے نکلے۔ تمہاری آنکھیں اس حادثے پر بہت
رو چکی ہیں۔ مگر اب تک تمہارے دل کا رونا باقی ہے۔ اور اگر رونا
ہے۔ تو اپنے دل کو رلاؤ۔ ورنہ صرف آنکھوں کی اس رونائی کو لے
کر کیا کیجئے۔ جس میں دل کی اشک فشانی کا کوئی حصہ نہیں ہے
حالانکہ انسان کی ساری کائنات حیات صرف دل ہی کی زندگی
سے ہے۔! فانھا لا تعمی الابصار ولکن تعمی
القلوب التی فی الصدور!۔

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

غرض مطلب یہی ہے کہ اس حادثۂ عظیمہ پر غور و فکر کی ایک
نئی صفِ ماتم بچھائیں۔ اور ان حقیقتوں اور بصیرتوں کی جستجو
میں نکلیں۔ جن پر آنکھوں کی اشک افشانیوں سے زیادہ دل
کے زخموں سے خون بہتا ہے۔ اور ہاتھوں سے زیادہ روح پر
ماتم طاری ہوتا ہے۔ فذکر ان الذکری تنفع المؤمنین

یادگار مشاہیر کی حقیقت

سب سے پہلی چیز جو اس سلسلہ میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ اس واقعہ کی یادگار اور اس کا دائمی تذکار ہے

دنیا میں ہر قوم نے اپنے ماضی کے ان واقعات و حوادث کی ہمیشہ تعظیم کی ہے۔ جن کے اندر قوم و ملک کے لئے کوئی غیر معمولی تاثیر یا عبرت پائی جاتی تھی۔ اور ہمیشہ ان انسانی بڑائیوں اور عظمتوں کی یاد کو یادگاروں، تہواروں۔ عمارتوں۔ تاریخوں، قومی روایتوں اور قومی مجموعوں کے انعقاد کے ذریعے زندہ رکھنا چاہا ہے جس کے اندر خود اس قوم کی کوئی عظمت اور بڑائی پوشیدہ ہے

یہی چیز ہے جس کو تمام اقوام متمدنہ نے "مشاہیر پرستی" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اور یہی چیز ہے کہ ہر قوم اپنی قومیتوں کے بڑے بڑے بانیوں۔ مذہبی معلموں محب الوطنوں اور قومی شہیدوں کی یاد کو کبھی مفقود ہونے نہیں دیتی۔

ہومر نے الیڈ لکھی۔ کالڈیا کے حجری[1] کتب خانے میں وہ

---

[1] حجری کتب خانے سے مقصود تمدن بابل و کالڈیا کا وہ عہد مدنی ہے جب کہ کتابیں پتوں اور درخت کی چھالوں کی وجہ سے جگہ پتھر پر کندہ کر کے لکھی گئیں۔ اور جن کا بڑا ذخیرہ بابل کے آثار عتیقہ میں موجود ہے!!

اینیٹں رکھی گئی۔ جن پر ناموران ملت کے مناقب محامد کندہ تھے
عرب جاہلیت نے اپنے سلسلہ دالنساب کا ایک حرف ضائع نہ ہونے
دیا اور ذوالمجیہ اور عکاظ میں اسلاف کے کارناموں کی داستان
سرائی قائم کی۔ مصریوں نے ایسے ایسے مینار بنائے۔ جو ہزاروں
برسوں کے بعد بھی اپنی تعمیر اولین کی طرح محکم و استوار ہیں اور
پھر ان کے اندر اپنے ناموروں کی لاشوں کو "ممی" کی صورت میں
محفوظ کر دیا۔ ہندوستان نے مہابھارت کے معرکے کو قومی
روایتوں میں داخل کر دیا۔ اور والمیک کی سحر طرازیوں نے نسلی
مفاخر کی روح کو پژمردگی سے بچایا۔ اقوام قدیمہ کے یہ تمام
اعمال صرف اسی حقیقت کے لئے تھے کہ اسلاف و مشاہیر کی یاد کو
زندہ و قائم رکھی جائے۔

آج اوقیانوس کا بحری مسافر واشنگٹن کے بت کو ساحل
امریکہ پر دیکھ کر دور سے پکار اٹھتا ہے۔ یورپ کے بڑے شہروں
اور ان کی محکوم نوآبادیوں کی شاہراہوں اور باغوں میں جا بجا
سنگی بت نصب نظر آتے ہیں۔ شیکسپیئر کا مولد اب تک قائم ہے
ملٹن کی میز کو مٹنے نہیں دیا جاتا۔ جانسن کے آثار اب بھی ہر شخص
دیکھ سکتا ہے۔ میلان میں ایک جگہ یہ سنگی کتبہ تم پڑھو گے "پاگ
مینرینی نے اپنا بچپن گذارا تھا"

یہ سب کچھ بھی اسی مشاہیر پرستی کی ایک زیادہ خوشنما دلفریب

شکل ہے۔ جو پہلے محض قومی روایتوں اور افسانہ طرازیوں کے ذریعہ قائم رکھی جاتی تھی۔

لیکن یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ اس تذکار و یادگار اصلی مقصد کسی واقعہ کو محض یاد رکھنا۔ یا کسی نام کو فراموشی سے محفوظ رکھنا ہی نہ تھا۔ بلکہ کچھ اور ہی مقصد تھا۔ کیوں کہ اگر یہی مقصد ہوتا۔ تو اس کے لئے کسی خاص نام۔ کسی خاص واقعہ کسی خاص حادثہ میں کوئی ممتاز خصوصیت نہ تھی۔ پچھلوں کو اگر یاد ہی رکھنا ہے۔ تو اس کے لئے بڑا اور چھوٹا۔ ادنیٰ و اعلیٰ نیک و بد سب یکساں ہیں۔ کون سی وجہ ہے کہ کارتھیج کے مشہور ہنے بال کو یاد رکھا جائے۔ اور ہٹیس کو یاد نہ رکھا جائے۔ جو اسی عہد میں گذرا تھا۔؟

سو وہ اصلی روح حقیقت جو اجتماع الثانی کی اس سب سے زیادہ پرانی رسم کے اندر کام کر رہی ہے۔ دراصل ناموں وجودوں۔ شخصیتوں اور محض تذکرہ و یاد آوری سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ اس سے اصلی غرض یہ تھی کہ جو اعمال حسنہ عزائم ہممہ۔ نتائج عظیمہ اور بصائر و مواعظ جلیلہ ان مشاہیر اور نامورں کی زندگی سے وابستہ ہیں۔ اور جن کی یاد اور تذکرے کے اندر قوموں اور ملکوں کے لئے سب سے زیادہ موثر اور نافذ دعوتِ عمل و اتباع ہے۔ اور ان کی یادگار کو ہمیشہ قائم رکھا جائے۔ اور مختلف ذریعوں

سے ایسے مواقع بہم پہونچائے جائیں۔ جن کی وجہ سے کبھی بھی آئندہ نسلیں ان اعمالِ حسنہ کے نمونوں کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔

پس یادگار دراصل انسانی افراد کی نہ تھی بلکہ انسان کے بہترین اعمال کی تھی۔ اور تذکرہ و یادآوری شخصوں اور حادثوں کی نہ تھی۔ بلکہ ان سچائیوں کی تھی جو اپنی زندگی کے اندر رکھتے تھے۔ خدا نے ذات کی بڑائی اور عظمت صرف اپنی ہی کبریائی کے لئے مخصوص کر لی ہے اور انسان کو جو کچھ دیا گیا ہے وہ صرف "عمل" کی بڑائی ہے دنیا میں کوئی انسان بڑا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ بڑا صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ فاطر السماوات والارض ہے۔ البتہ "عمل" بڑا ہو سکتا ہے۔ اور اس کی بڑائی سے اس کے حامل کے اندر بھی نسبتی اور اضافی بڑائی آ جاتی ہے۔ پس ساری تعظیمیں، ساری تقدیسیں ہر کام کا احترام و شرف جو دنیا میں کیا جا سکتا ہے۔ یا تو خدا کے لئے ہے۔ یا خدا کی سچائی اور اس کے قرار دیئے ہوئے اعمال حسنہ کے لئے۔ خود انسان کی ذات کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ الحمد للہ رب العالمین "الحمد" کے الف لام کا یہی مطلب ہے اور انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوباً وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

(۳: ۴۹: ۱۳۱) سے اسی پر روشنی پڑتی ہے اور یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا (۳: ۱۸۸) یہ بد بخت چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف و ثنا ان اعمال کے لئے کی جائے۔ جو انھوں نے نہیں کئے۔ حالانکہ "حمد" کا استحقاق تو اعمال ہی کو تھا۔ اسی کی مزید توضیح کرتا ہے۔ وما یعقلھا الا العالمون

ایک عالمگیر غلطی

لیکن دنیا کا خسران صرف اسی میں نہیں ہے کہ وہ سچائی کی طرف نہیں بڑھتی بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اکثر اوقات اس کی جانب قدم تو اٹھاتی ہے۔ پر ایسا ہوتا ہے کہ راہ ہی میں گم ہو جاتی ہے۔ اور جس طرح اس کی طرف نہ چل کر اس سے محروم تھی۔ ٹھیک ٹھیک اسی طرح اس کی طرف چل کر بھی محروم رہتی ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ قرآن حکیم نے انسان کے نقصان و خسران کے جو مختلف حالات بیان کئے ہیں۔ ان میں سے ایک زیادہ عام اور زیادہ پیش آنے والی حالت کے لئے "ضلالت" کا لفظ اختیار کیا ہے سورۂ فاتحہ میں "مغضوب علیہم" کے ساتھ ایک اور گروہ کا باسم "الضالین" تذکرہ کیا گیا ہے۔ "ضلالت" کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ تم کو معلوم ہے کہ "گمراہی" اور "راستے میں بھٹک جانے" کے ہیں اسی لئے متحیر اور غیر متعین نظر رکھنے والے پر بھی "ضال" کا اطلاق ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی متعین راہ اس کے سامنے نہیں

ہوئی۔ پس قرآن کریم نے نوعِ انسانی کی بدحالی و تباہی کی سب سے بڑی عام حالت کو اسی لفظ سے تعبیر کیا، اور اس میں بڑا نکتہ یہ ہے کہ لبا اوقات انسان کو اٹھنے اور چلنے سے انکار نہیں ہوتا۔ وہ سفر تو کرتا ہے۔ پر ہوتا یہ ہے کہ منزل مقصود کی حقیقی شاہراہ اس پر نہیں کھلتی۔ اور وہ راہ ہی میں بھٹک کر رہ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ باوجود چلنے کے منزل مقصود سے اسی طرح محروم رہتا ہے۔ جس طرح وہ شقی محروم رہا جس نے چلنے کا قصد ہی نہیں کیا تھا۔ یہی حقیقت اصطلاح قرآنی میں "تحبط اعمال" کی ہے۔ جس پر جا بجا مختلف پیرایوں میں زور دیا گیا ہے کہ حبطت اعمالھم (۱۸: ۱۰۴) ان کی تمام محنتیں، کوششیں اور راہ روی کی مشقت بالکل اکارت گئی۔ اور اس کا کوئی پھل انھیں نہ ملا۔

چنانچہ اس "ضلالت" عمل کی ایک عمدہ مثال دنیا کی عالمگیر "مشاہیر پرستی" بھی ہے۔ جو مقصد کے لحاظ سے ایک نہایت اہم عظیم المنفعت حیات پرور اور سعادت بخش حقیقت تھی۔ لیکن بایں ہمہ اس بارے میں ہمیشہ قوموں نے غلطی کی اور اکثر حالتوں میں سخت ٹھوکر کھائی۔ وہ دنیا کی عالمگیر ضلالت کبرائے جو اس کے ہر عمل میں حقیقت اور مقصد کو فنا کرتی۔ اور ظاہر ورسوم کی اس سے پوجا کراتی ہے۔ افسوس کہ اس حقیقت کے

لیے بھی ہلاکت بخش ہوئی۔ اور گمراہیوں اور حقیقت ناشناسیوں سے اس طرح اس عمل عظیم کو آلودہ کر دیا گیا۔ کہ لیا اوقات ہدایت کی جگہ ضلالت کا ایک بہت بڑا پتھر ثابت ہوئی۔

انسان کی عالمگیر غلطی یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو اس کی روح کے لئے اختیار کرتا ہے۔ لیکن آگے چل کر صرف اس کے جسم ہی کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ مشاہیر و سلف پرستی کا اصلی مقصد تو اعمال حسنہ کی یاد اور نیکی و صداقت کے عملی نمونوں کو پیروی و اتباع کے لئے قائم رکھنا تھا۔ لیکن نتیجہ بالعموم یہ نکلا کہ اعمال کی یاد مٹ گئی۔ اور محض انسانوں کی شخصیتوں اور ناموں کی پوجا ہونے لگی۔ یعنی وہ چیز کہ کسی دوسرے مقصد کے لئے وسیلہ و ذریعہ تھی۔ خود ہی مقصود بالذات بن کر لوگوں کے عقائد و اعمال میں جاگزیں ہو گئی۔ اور حقیقت سے اس قدر بعد و تنزل ہو گیا کہ محض رسوم و اسمار کی عظمت و پرستش ہی پر ہر شخص قائم ہو۔

یہی وجہ ہے کہ مشاہیر پرستی لبا اوقات دنیا میں بت پرستی کا ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔ اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ اعمال کی جگہ افراد و اسمار کی پرستش محض نے دو تین نسلوں کے بعد انسان کو بت پرستی تک پہونچا دیا۔

یہی حقیقت اعلیٰ ہے جسے قرآن حکیم نے

اسوۂ حسنہ اسوہ حسنہ کے جامع و بالغ لفظ سے تعبیر کیا

اور بھی مقام ہے۔ جہاں آکر اسلام کی قوت اصلاح اور ختم نبوت کی اصلی علت آشکارا ہو جاتی ہے کہ کس طرح اس نے دنیا کی تمام صداقتوں کو لے لیا۔ اور ساتھ ہی کس طرح ان تمام خرابیوں اور ضلالتوں سے محفوظ بھی کر دیا۔ جن کے اختلاط آلودگی سے ان کی روح حقیقت اور تاثیر عمل بالکل فنا ہو گئی تھی۔ ؟

لا یاتیہ الباطل عن من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید ! (۴۱ - ۴۲)

قرآن ایک ایسا معلم وہادی ہے کہ نہ تو اس کے آگے باطل جم سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے اسے جگہ مل سکتی ہے۔ وہ خدائے حکیم کا اتارا ہوا ہے۔ پھر باطل کا یہاں کیا گذر!

ہاں باطل کیوں کر اب اس کے ساتھ مل سکتا ہے۔ جب کہ وہ "حق خالص" ہے۔ اور سچائی کے ساتھ جس قدر بھی گمراہی ملادی گئی تھی۔ اس سے انسان کے ہر اعتقاد و عمل کو بالکل پاک و صاف کر دیا ہے! نیز جا بجا قرآن حکیم کو "ہادی" کہا کہ وہ انسان کو اس کے سفر اعمال میں ٹھوکروں اور گمراہیوں سے بچاتا ہے۔ اور اسی طرح "شفا" کہا۔ کیونکہ وہ مثل مفید و نافع ادویہ کے لئے ہے۔ جو مریض کی اصلی قوت طبیعی کو مزید توانائی اور نشوونما دیتی ہے۔ اور مضر اثرات مرض جو داخل طبیعت ہو گئے ہیں۔ ان کو دور کر دیتی ہیں۔

"اسوہ" کہتے ہیں کسی فکر، کسی عمل، کسی وصف، کسی خاصہ کے

ایک ایسے نمونے کو جسے تم اس لئے اپنے سامنے رکھ لو کہ اس کی پیروی اور نقل کرو گے۔ اور اسی کی سی باتیں اپنے اندر بھی پیدا کر سکو گے۔

انسانی سعادت کے لئے تعلیم محض بالکل بیکار ہے جب تک کہ اس تعلیم کے زندہ نمونے بھی انسانوں کے سامنے نہ ہوں۔ جو اثر طبیعت منفعلہ انسانیہ پر ایک انسانی نمونہ عمل کا پڑتا ہے۔ وہ محض تعلیم کی سماعت سے نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ اخلاق کی کتابیں اپنی موثر تعلیمات سے انسانوں کو رلا سکتی ہیں۔ مگر اس کے دلوں کو نہیں پھیر سکتیں۔ عدالت کا قانون مجرم کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال سکتا ہے۔ لیکن اس کو جرم سے باز نہیں رکھ سکتا۔ حکماء کے حکیمانہ نصائح نیکیوں کی بڑی بڑی تعریفیں۔ اور بروں کی بڑی بڑی برائیاں بتلا سکتے ہیں۔ لیکن کسی برے انسانوں کو نیک نہیں بنا سکتے۔

بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

لیکن برخلاف اس کے اگر ایک پاک انسان اپنی زندگی کے اندر نیکی کا عملی نمونہ رکھتا ہو۔ اور اس کے اعمال حیات راست بازی کے لئے اسوہ کا حکم رکھتے ہوں۔ تو وہ صرف اپنا نمونہ دکھلا کر نہ صرف افراد و اشخاص کو بلکہ اقوام و امم کے اعمال

کو یکسر پلٹ سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ہدایت خلق اللہ کے لئے صرف کتابوں اور شریعتوں ہی کو نہیں بھیجا۔ بلکہ اس کے ساتھ انبیاء کرام علیہم السلام کا (کہ ان کے خاص عمل تھے) عملی نمونہ بھی دکھلا دیا۔ وہ جس دستورالعمل کی طرف قوم کو بلاتے تھے۔ اس کا عملی پیکر خود ان کی پاک ومطہر زندگی ہے۔ اگر شریعت بصورت قانون تختیوں اور کاغذوں پر منقوش تھی۔ تو بصورت وجود حی و قائم ان کی زندگی کے اندر بھی پڑھی جا سکتی تھی۔ اگر اس کی آیات بینات حروف واصوات کی شکل میں دنیا کو دعوت دیتی تھیں۔ تو انبیائے کرام کی زندگی عمل وفعل کے اندر سے اس کی تصویر دکھلا دیتی تھی۔ اگر قانون کہتا تھا کہ انسان کو ایسا کرنا چاہیئے۔ تو حیات نبوت تشا[illegible] کر کے دکھلا دیتی تھی کہ اس طرح کیا گیا۔ اور اس طرح کیا جا سکتا ہے۔

یہی حقیقت ہے کہ جس کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس وقت بیان کیا تھا۔ جبکہ ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق واعمال کا حال پوچھا گیا تھا کہ کان خلقہ القرآن اگر تم ان کے خلق عظیم کو معلوم کرنا چاہتے ہو۔ تو قرآن کو دیکھ لو یہاں حروف والفاظ ہیں۔ وہاں ایک پیکر مجسم تھا۔ یہاں [illegible] ہے وہاں فعل تھا۔ یہاں چراغ ہے۔ وہاں اس کی روشنی تھی۔

حقیقت ایک ہی ہے۔ جس نے ایک جگہ علم کی اور دوسری جگہ عمل کی صورت پائی ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ "سنت" کتاب کا ایک حقیقی جزو اور مفہوم کتاب میں تبعاً داخل ہے۔ کوئی علیحدہ اور مستقل وجود نہیں رکھتی۔ جو ظاہر بیں اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وہ قرآن کے ساتھ "حدیث" کا لفظ سنتے ہیں۔ تو اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ حدیث کی پیروی کا مطالبہ ایسا مطالبہ جو "قرآن" کے علاوہ ایک دوسری قوت کا اثبات کرتا ہے حالانکہ "سنت" کی اطاعت "کتاب" کی اطاعت میں داخل ہے۔ اور سنت علم قرآنی کی عملی تفسیر ہے

اور اگر یہ صحیح ہے کہ جناب امیر علیہ السلام نے خوارج و منکرین کے مقابلہ میں فرمایا تھا کہ "میں قرآن ناطق ہوں" تو میں اس کی تصدیق کرنے کے لئے تیار ہوں کہ اگرچہ حقیقت ناشناس طبیعتیں سمجھتی ہیں۔ کہ یہ بہت بڑا دعوے تھا۔ یقیناً یہ بڑے سے بڑا دعوے تھا۔ جو کوئی انسان کر سکتا ہے۔ لیکن اگر حضرت امیر نے کیا تھا۔ تو غلط نہ تھا۔ اگر اس کی مقدس زندگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے "اسوہ حسنہ" کا ایک کامل عکس تھا۔ اور ان کے اعمال کی روشنی سراج منیر رسالت ہی سے ماخوذ تھی۔ تو کیوں انھیں حق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنے تیئں "قرآن ناطق" کہیں؟

جو کتاب الٰہی ما بین الدفتین حروف و نقوش کی شکل میں تھی اس کی ہستی ناطق تھی۔ جو اعمال حضرت مرتضوی کے اندر سے پکارتی تھی۔ خوارج سمجھتے تھے کہ یہ علی ابن ابی طالب کی آواز ہے لیکن ابوذر اور سلمان کی حقیقت شناسی جانتی تھی۔ کہ یہ علی بن ابوطالب کی آواز نہیں ہے۔ بلکہ "القرآن الحکیم" کی صدائے الٰہی ہے۔ اور چونکہ "القرآن" کی آواز ہے۔ اس لئے یقیناً خود منزل القرآن کی آواز ہے۔ کنت سمعہ الذی یسمع بہ ولسانہ الذی تیلکمد بہ (بخاری)۔ بہرحال یہ مبحث بجائے خود محتاج تفصیل و نظر ہے مختصر یہ کہ سعادت و ہدایت انسانی کے لئے "تعلیم" کے ساتھ "نمونہ" اور "کتاب" کے ساتھ "سنت" ایک ضروری حقیقت ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم نے اپنی تعلیمات کے لئے اس چیز کو اساسی حقیقت قرار دیا۔

لقد جاءکم من اللہ	بلاشبہ تمہارے پاس اللہ کی طرف
نور و کتاب مبین	سے نور ہدایت آیا۔ اور کتاب الٰہی جس کی
(۵ - ۱۷)	تعلیم بالکل واضح اور روشن ہے

اس آیتہ کریمہ میں "نور" سے مراد حامل قرآن (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وجود اقدس ہے۔ اور "کتاب مبین" قرآن ہے۔ یہ "نور" وہی "اسوۂ حسنہ" ہے۔ جو حامل قرآن کی مقدس زندگی میں "علم" قرآنی کا وجود "عملی" تھا۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (۳۳-۲۱)	بلاشبہ تمہارے لئے اللہ کے رسول کی زندگی میں پیروی واتباع کے لئے ایک بہترین نمونہ ہے۔

عربی میں "اسوہ" کا لفظ ہر نمونہ کے لئے کہا جاتا ہے۔ اور نمونہ جس طرح خیر کا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح شر کا بھی ہو سکتا ہے اس لئے قرآن حکیم نے "حسنہ" کے لفظ سے اسے متصف کیا تاکہ واضح ہو جائے کہ فضائل و محاسن ہی کا نمونہ مقصود ہے اسی طرح تمہیں معلوم ہے کہ سورۂ ممتحنہ میں بھی دو جگہ ملت حنفی وفطری کے اولین موسس حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہی لفظ آیا ہے۔ قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہ

دنیا میں اعمال مقدسہ وحسنہ کی یادگار قائم کرنے کا مقصد بھی یہی "اسوۂ حسنہ" تھا۔ یعنی جن لوگوں نے کسی پاک و اعلیٰ عمل کا بہترین نمونہ اپنی زندگی میں پیش کیا ہے۔ ان کی یاد کو ہمیشہ باقی رکھا جائے۔ تاکہ ان کی یاد کے ساتھ ان کے اعمال کی یاد بھی تازہ ہوتی رہے۔ اور اس کا نمونہ انسانوں کو عزائم امور کی طرف دعوت دے۔

اب دیکھو کہ قرآن حکیم نے کس طرح دنیا کی اس قدیم ترین رسوم کی اصلی حقیقت لے لی۔ اور کس طرح اس کی آلودگیوں کو اس

سے بالکل الگ کر دیا۔ اس نے یادگاروں کے لئے بت نہیں بنائے جن کو حوادث ارضی کا ایک طمانچہ گرا دے سکتا ہے۔ اور جن کا وجود انسان کی عظمت کے لئے ایک سخت داغ تھا۔ اس نے اینٹ اور چونے کی عمارتیں نہیں بنائیں۔ جو طوفان و برق کے ایک حملے کی بھی تاب نہیں لاسکتیں۔ اور جن اثر ظواہر سے آگے نہیں بڑھتا۔ اس نے سالانہ مجمعوں اور قومی تقریروں پر زور نہیں دیا۔ کیونکہ یہ وسائل ہمیشہ ظواہر و رسوم پرستی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اور یادگار کی معنویت مفقود ہو جاتی ہے۔ غرض کہ اس نے ان تمام وسائل تذکار سے یک قلم انکار کر دیا۔ جو عام طور پر تمام قوموں سے رائج تھے۔ اور جن کے ذریعہ خود انسانوں کی بڑائی تو کی جا سکتی تھی۔ پر عمل کی تقدیس و تعظیم کے لئے ان کے اندر کچھ نہ تھا۔ اور اس لئے ان کا وجود انسان کی حقیقت پرستی کی راہ میں ایک سخت پتھر ثابت ہوا تھا۔

سورۂ کریمہ فاتحہ اب ہم کو تمام تمہیدوں اور مقدمات کی مبادیات سے گزر کر اصل موضوع کے قریب زیادہ تیز قدمی کے ساتھ آنا چاہیئے۔ یاد ہوگا کہ اس مقالہ کی ابتدا سورۂ مبارکہ "فاتحہ" سے کی گئی تھی جسے بظاہر اصل موضوع سے کوئی ربط معلوم نہیں ہوتا۔ "السبع المثانی" ہے۔ وہ تمام "الکتاب" کا متن ہے۔ اور وہ اس کی تمام

تفصیلات کا وجود اجمالی ہے۔ پھر ہدایت انسانی کا کون سا مقام ہے۔ جو قرآن کے احاطۂ بیان سے باہر رہ گیا ہو؟

غرض کہ قرآن حکیم نے یادگار و تذکار کے ان تمام رسمی اور ضلالت آمیز طریقوں سے انکار کر دیا۔ جو عام طور پر دنیا نے اختیار کئے تھے۔ لیکن جب کہ اس نے وہ سب کچھ نہ کیا۔ جو سب کوئی کرتے تھے۔ تو سوال یہ ہے کہ اس نے خود کیا کیا؟

اس نے "اسوۂ حسنہ" کی اصلی حقیقت کو اپنی تمام تعلیم کا جزو اعظم بنایا۔ اور اس کی یادگاروں کو انسان سے باہر نہیں جن کو انسان چھوڑ دے سکتا ہے۔ بلکہ خود انسان کے اندر قائم کر دیا۔ جو کبھی بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکتا۔ اس نے مادی و جسمانی اعمال و اشکال کے اندر اس کی دعوتِ عمل و سعادت کو گم نہیں کر دیا۔ جیسا کہ گم کر دی گئی تھی۔ بلکہ اس کو ایک خالص معنوی و روحانی اعتقاد بنا کر اس طرح دلوں کے اندر قائم کر دیا۔ کہ اس کی حقیقت دائمی طور پر زندہ ہو گئی۔ اور ہر طرح کی آلودگیوں اور رسم پرستیوں کی آمیزش سے بالکل محفوظ و مصون بنا دی گئی۔

اس نے سب سے پہلے ہمیں ایک مقدس "دعا" تبلائی اور حکم دیا کہ دن میں پانچ مرتبہ جب اپنے پروردگار کے حضور بندگی و نیاز کے لئے حاضر ہو۔ تو سب سے پہلے اسی دعا کو پڑھو۔ وہ وقت

ہو گا۔ جب تم رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ اور اس کی رحمت کا دروازہ باز ہو گا۔ پس ایک عاجز و درماندہ انسان فاطر السماوات والارض کے حضور جا کر اپنے لئے سب سے بڑی نعمت اور سب سے زیادہ قیمتی دولت جو اس مانگ سکتا ہے۔ وہ اس دعا میں مانگی گئی ہے۔ اور چاہیئے کہ تم اسی نعمت کے سائل۔ اسی مطلوب کے طالب اور اسی محبوب کے عاشق ہو!

یہ "دعا" سورۂ فاتحہ ہے۔ جو ہر مومن دن میں پانچ مرتبہ نماز کی ہر رکعت کے اندر پڑھتا ہے۔ اور وہ نعمت۔ وہ دولت وہ متاع مطلوب و محبوب "الصراط المستقیم" ہے۔ جس کے مانگتے رہنے اور طلب کرتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اھدنا الصراط المستقیم خدایا! تو ہمیں الصراط المستقیم پر چلنے کی توفیق دے

یہ الصراط المستقیم کون سی راہ ہے۔ اور اس سے مقصود کیا ہے؟ اس کی یہاں کوئی تشریح نہیں کی گئی البتہ یہ بتلایا گیا ہے کہ۔

صراط الذین انعمت ان لوگوں کی راہ جن پر اے پروردگار علیھم (فاتحہ) تو نے انعام کیا۔

پس اس تصریح سے صراط مستقیم وہ راہ ہوئی جو انعام یافتہ

لوگوں کی راہ ہے۔ یعنی جن لوگوں پر خدا نے اپنی نعمتیں نازل کی ہیں انہی کی راہ عمل الصراط المستقیم ہو گی۔

چنانچہ سورۂ نساء میں "انعام یافتہ" جماعتوں کا بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ "انعمت علیہم" میں کن لوگوں کی طرف اشارہ تھا۔ اور جن لوگوں نے اللہ اور رسول

ومن یطع اللہ والرسول	کی اطاعت کی۔ تو وہ سب ان
فاولٰئک مع الذین	خوش نصیبوں کے ساتھی ہو جائیں گے
انعم اللہ علیہم من	جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے اور
النبین والصدیقین وا	جن پر انعام کیا ہے۔ وہ انبیاء ہیں۔ صدیقین
لشھداء والصالحین وحسن	ہیں۔ شہداء ہیں۔ اور صالحین ہیں۔
اولٰئک رفیقا (۴: ۷۱)	جس کسی کو ایسی انعام یافتہ

جماعتوں کی معیت ملی۔ تو کیا اچھی ہے اس کی معیت اور کیا اچھے ہیں اس کے رفیق۔!

اس آیۃ کریمہ نے صاف صاف بتلایا ہے کہ سورہ فاتحہ میں جس "الصراط المستقیم" کے تعین کے لئے صرف اس قدر اشارہ کیا گیا تھا۔ کہ وہ "انعام یافتہ لوگوں کی راہ" ہے۔ وہ کون لوگ ہیں؟ نیز ان کے مختلف مدراج ومقامات کیا کیا ہیں۔ جن جماعتوں کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ اور انھیں "انعام یافتہ" کہا ہے۔ انہی کی راہ عمل و راہ ہدایت وسعادت ہو گی۔ جس کا نام لسان الٰہی نے

"الصراط المستقیم" رکھا ہے۔ اور جس پر چلے بغیر کوئی فرد اور کوئی قوم "مغضوب علیھم" اور "الضالین" کی صراط مغضوبیت و ضلالت سے الگ نہیں ہو سکتی۔

سورۂ نسا کی اس آیۃ کریمہ سے "انعمت علیھم" کی مزید تفسیر و تشریح کرنا ایک ایسی مسلّم اور متفق علیہ تفسیر ہے۔ جسے عہد صحابہ و اہل بیت نبوۃ (رضوان اللہ علیہم) سے لے کر طبقات متاخرہ تک تقریباً تمام ارباب علم و رسوخ نے اختیار کیا ہے۔ اور مفسرین "خاصہ" و "عامہ" سب نے اسے قبول کیا ہے۔ چنانچہ جس طرح محدث ابن جریر طبری نے اس کے متعلق مفسرین صحابہ کے آثار جمع کئے ہیں۔ اسی طرح علامہ کلینی اور شیخ طبرسی (صاحب تفسیر مجمع البیان) بھی اس سے انکار نہیں کرتے۔ اس عاجز نے تفسیر "البیان" میں تصریحات حضرات ائمہ کرام علیہ السلام و اقوال مفسرین خاصہ بھی نقل کر دیئے ہیں۔ فمن شاء التفصیل فلیرجع الیہ

بہر حال یہ آیۃ کریمہ بتلاتی ہے کہ جس راہ پر چلنے کی سورۂ فاتحہ میں ہر مومن التجا کرتا ہے۔ وہ راہ "انعام یافتہ" گروہ کی ہے انعام یافتہ گروہ چار ہیں۔ الانبیاء۔ الصدیقون۔ الشہداء الصالحون!

اب دیکھو کہ قرآن حکیم نے یادگار کے اصلی مقصد کو تمام آلودگیوں اور ضلالتوں سے صاف کر کے کس طرح قائم کر دیا ہے

اور اس کے لئے کیسی دائم وقائم اور محفوظ و مصؤن راہ اختیار کی
اس نے نیک انسانوں اور اعلیٰ ترین ہستیوں کی یادگاریں ز
پر قائم نہیں کیں۔ لیکن ان کے اعمال کو ہر مومن کے دل پر نقش
کر دیا۔ اس نے ہر مومن باللہ پر پانچ وقت کی نماز فرض کی۔ اور
دیا کہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت کرو۔ سورۂ فاتحہ کیا ہے
تحمید و تقدیس کے بعد ایک التجا ہے۔ جو انسان اپنے خدا
کے حضور کرتا ہے۔ وہ التجا کیا ہے؟ "الصراط المستقیم" پر چلنے
التجا ہے۔ تاکہ اس کی راہ سے اسے توفیق ملے۔ اور سعادت کو نین
حاصل ہو۔ اب اور آگے بڑھو۔ اور دیکھو کہ "الصراط المستقیم" کون
سی راہ ہے جسے ہر روز دن میں پانچ بار ہر مومن یاد کرتا۔ اور اپنے
کے حضور جا کر مانگتا ہے۔ فرمایا کہ وہ ان لوگوں کی راہ ہے۔ جن پر الل
اللہ نے انعام کیا۔ یہاں اس راہ کا طریق حصول یا اس کے عقا
و اعمال نہیں بتلائے گئے۔ بلکہ صرف ان لوگوں کی طرف توجہ دلا
گئی۔ جنہوں نے ایسے عقائد۔ ایسے اعمال۔ ایسے عزائم۔ ایسے اق
کئے تھے۔ جن کی وجہ سے خدا کی نعمتوں کے مستحق ٹھہرے
چیز "یادگار" ہے یہی "تذکار" ہے۔ یہی وہ "مشاہیر پرستی" کی
اصلی ہے۔ جس کو تمام دنیا نے ڈھونڈا مگر نہ پایا۔ وہ کبھی پتھر کے تو
کبھی اینٹوں کی عمارتوں کبھی انسانوں کے مجسموں۔ کبھی ملکوں اور قو
کی وقتی رسموں اور تقریبوں میں بھٹک کر رہ گئی۔ اور صراط الذین انعم

"علیہم" کی جگہ "الضالین" کی صراط پر چلی گئی!

"مشاہیر پرستی" کے زوائد کو چھوڑ دو۔ صرف اس کی اصلی حقیقت اپنے سامنے لاؤ۔ وہ کیا ہے؟ کیا صرف یہی نہیں ہے۔ کہ جن انسانوں نے دنیا میں بڑے بڑے کام انجام دیئے ہیں۔ اور نیکی وصداقت کی راہ پر چلے ہیں۔ ان کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھا جائے۔ تاکہ ان کی یاد ان کے مقدس کاموں اور نیک عملوں کی یاد کو تازہ کر دے اور اس یادآوری و تازگی سے قوموں کے لئے پاک ارادوں اور اعلیٰ کاموں کے کرنے کی تحریک ہو؟ اگر یہی ہے تو کیا تم نہیں دیکھتے کہ سورۂ فاتحہ کے اندر یہی حقیقت کس طرح کارفرما ہے۔ سورۂ فاتحہ نے انسان کی راہ سعادت و ترقی کے لئے نہ عقائد و افکار بیان کیئے۔ اور نہ اعمال و افعال۔ بلکہ ان انسانوں کی طرف توجہ دلائی جو انعام یافتۂ الٰہی تھے۔ یعنی جو انسان راہ سعادت کو حاصل کرنا چاہتا ہے چاہیئے کہ انعام یافتہ انسانوں کی یاد کو ہر روز اپنے سامنے لائے اور ان کے عقائد و اعمال کے نمونے کو کبھی فراموش نہ کرے۔ پھر اگر یہ دنیا کی پاک عمل ہستیوں کی سچی یادگار اور ان کا حقیقی تذکار نہیں ہے۔ تو اور کیا ہے؟ یقیناً یہ تذکار ہے۔ مگر ایسا تذکار جو اپنے خصائص کے لحاظ سے تمام دنیا میں کوئی نظیر نہیں رکھتا۔

پھر ان انعام یافتہ لوگوں کی تشریح کی کہ وہ انبیاء صدیقین ہیں۔ شہداء ہیں۔ صالحین ہیں۔ پھر ان میں سے ہر گروہ کے

وہ اعمال حسنہ جا بجا قرآن حکیم میں مشرح بیان کیے۔ جن سے الصراط
المستقیم" کی راہ سعادت متعین ہوتی ہے۔ قصص القران کی اصلی
غرض اسی "انعمت علیہم" کی تفسیر سمجھو۔ یہ چار گروہ ہیں۔ جن کے اندر نوع
انسان کا بہترین حصہ آگیا۔ اور انسانی عمل کی سچائی جب کبھی ظاہر
ہوگی۔ تو ضرور ہے کہ انہی انعام یافتہ چار جماعتوں میں سے کسی
جماعت سے متعلق ہو۔ پس غور کرو کہ تم یادگار، یادگار پکار
رہے ہو۔ تمام دنیا مشاہیر پرستی کے لئے بیقرار ہے۔ کرہ ارضی کی
ہر متمدن انسانی جماعت انسانی بڑائیوں کی یادگار قائم کرنا چاہتی
ہے۔ لیکن یہ کیسی یادگار کی عجیب و غریب خالص حقیقت ہے جو ا
کی تمام خرابیوں کو دور کر کے قرآن حکیم نے ہمیں عطا کی ہے۔ دنیا
کی ہر قوم صرف اپنے ہی بڑوں کو یادگار کا مستحق سمجھتی ہے۔ اور
زیادہ سے زیادہ چند بڑے انسانوں کو یاد رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن
قرآن حکیم نے کرہ ارضی کی تمام حقیقی بڑائیوں اور اعمال صالحہ
کے تمام گھرانوں کو چن لیا۔ اور حکم دیا کہ تم ان سب کے نمونوں
اپنے سامنے رکھو۔ اور سب کے بڑے بڑے کاموں۔ بڑے بڑے عزموں
بڑی بڑی نیکیوں سے اپنی راہ ایمان و اسلام کو مرکب و متقوم سے
تم یادگاریں بنا کر سال میں ایک مرتبہ انہیں یاد کر سکتے ہو۔ اور
وسنگی اشکال میں کبھی کبھی ایک غلط انداز نظر ڈال سکتے ہو۔ ا
سے زیادہ تمہارے تذکار کی حقیقت کچھ نہیں ہے۔ لیکن دیکھو تم

قرآن نے کیسی یادگار قائم کی۔ جو ہر روز دن میں پانچ مرتبہ
ہر مومن انسان کے سامنے آتی ہے۔ اور صرف ایک ہی بڑے
انسان کو نہیں بلکہ تمام راست باز انسانوں کو جو انبیاء صدیقین
شہدا اور صالحین ہیں گذرے۔ وہ یاد کرتا اور ان کے اعمال
مقدسہ کے نمونوں پر چل کر راہ سعادت کی منزل مقصود
تک پہنچنا چاہتا ہے۔

تمّت

(ادبی پریس رابسن روڈ کراچی)

داستانِ کربلا

حادثۂ کربلا پر مشاہیر علما اور
ممتاز اہلِ قلم کے بصیرت افروز
مقالات کا مجموعہ!

مرتبہ

محمد عبدالرحمٰن سعید صدیقی

نفیس اکیڈمی
بلاسس اسٹریٹ - کراچی (پاکستان)

قیمت: - تین روپے